ادبی تخلیقیں مردوں سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ اُردو میں اگر کوئی خاتون
اس درجہ کو نہیں پہنچ سکی تو کم از کم یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ
ان میں سے بعض نے وہی مرتبہ حاصل کرلیا ہے جو ملک کے اچھے
لکھنے والے مردوں نے۔ ان خاتونوں میں حجاب اسمٰعیل کا نام پیش پیش
ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں ادب لطیف کی جو روش بہت عام
ہے اُس کے بہت اچھے نمونے مردوں میں ہمیں سجاد حیدر کے
یہاں ملتے ہیں اور عورتوں میں صرف حجاب اسمٰعیل کے یہاں۔
ان کے زیادہ افسانوں میں ادب لطیف کی اس خاص روش نے
ایک کیف اور سرور پیدا کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ چیز
کوشش سے پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ فطری معلوم ہوتی ہے۔

بلقیس جمال

بلقیس جمال اُردو افسانہ نگاری کی دنیا میں بہت دن سے مشہور ہیں۔ اور ان کے افسانے ہر حلقہ میں قدرومنزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ پلاٹ کی ساخت اُس کی ترتیب اُس کے لطف اور افسانویت کے علاوہ زبان اور طرزبیان میں ہر جگہ پختگی ہے اور یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ افسانہ کسی ایسی خاتون کا لکھا ہوا ہے، جو ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتی ہے جس کی عورتیں ادب کے نام تک سے بے بہرہ ہیں۔

بلقیس جمال نے اب لکھنا بہت کم کردیا ہے اور اس کی کمی ہر شخص شدت سے محسوس کررہا ہے۔

حجاب اسمٰعیل

حجاب اسمٰعیل اُن چند خاتونوں میں سے ہیں جن پر اُردو کو ناز ہونا چاہیئے۔ عورتوں کو دوسرے ادبوں میں عموماً وہی مرتبہ حاصل ہے جو مردوں کو۔ بلکہ دوسری قوموں کی بعض عورتوں کی

اس درجہ پر پہونچ جائے گی کہ دوسری زبانوں سے مقابلہ کرتے وقت اُس کا یہ سرمایہ بھی ایک مستقل چیز سمجھ کر اُس میں شامل کرلیا جائے۔

طاہرہ دیوی

طاہرہ دیوی شیرازی نے اُردو افسانہ نگاری میں بہت جلد ایک خاص حیثیت حاصل کرلی اور اُن کے چند ہی افسانے پڑھ کر لوگوں نے انھیں اتنا سراہا کہ اسے اُن کی آئندہ ترقی کے لئے ایک نیک فال کہا جاسکتا ہے۔ اُن کے چند افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک ایسا ہے جس سے اُن کے فن سے فطری لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ گوئی کا فن حقیقت میں اکتسابی نہیں، بلکہ اس کے نازک اور لطیف نکات صرف فطرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ فن کے متعلق بارہا کہا گیا ہے کہ اُسے اکتساب سے کم تعلق ہے، اُردو افسانہ نگاروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جن پر اس بات کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ طاہرہ دیوی کا نام اُنھیں چند گنے چُنے لوگوں میں سے ہے۔

ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو افسانہ نگاری کے مقررہ حدود میں نہ آجاتا ہو۔ کسی میں پلاٹ ہے تو کسی میں کردار یا ماحول کی ترجمانی۔ کسی میں ان تینوں میں سے دو چیزیں ہیں تو کسی میں تینوں۔
ان مضامین کو افسانہ ماننے کے بعد جب ہم اُن پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس سرمایہ کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اگر اسی قسم کے دو ایک افسانہ نگار اُردو میں اور پیدا ہو جائیں تو اُردو کا خزانہ ایسے جواہر پاروں سے بھر جائے کہ مغرب بھی اُس پر رشک کرے۔ افسانوں کا فطری انداز۔ نفسیاتی پہلو۔ جزئیات کا ماہرانہ بیان۔ کردار نگاری اور اُس کے ارتقائی اصول کی پابندی۔ پلاٹ کی دلچسپی کون سی چیز ہے جو اُن میں موجود نہیں۔ طرز بیان ہے اُس کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک نوعمر زبان میں طرز بیان کی یہ بلندی اور کچھ نہیں تو اعجاز ضرور ہے۔
اس طویل فہرست کے بعد بھی اُردو کے بہت سے مرد افسانہ نگاروں کے نام جان بوجھ کر نظر انداز کر دئے گئے ہیں اور اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو دو ایک برس میں بہت اچھے فسانہ نگار ہو جائیں گے۔
افسانہ نگاری کی یہ روش دیکھ کر دل بے حد خوش ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو افسانہ نگاری بہت جلد

ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو افسانہ نگاری کے مقررہ حدود میں نہ آجاتا ہو۔ کسی میں پلاٹ ہے تو کسی میں کردار یا ماحول کی ترجمانی۔ کسی میں ان تینوں میں سے دو چیزیں ہیں تو کسی میں تینوں۔

ان مضامین کو افسانہ ماننے کے بعد جب ہم اُن پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس سرمایہ کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اگر اسی قسم کے دو ایک افسانہ نگار اُردو میں اور پیدا ہوجائیں تو اُردو کا خزانہ ایسے جواہر پاروں سے بھر جائے کہ مغرب بھی اُس پر رشک کرے۔ افسانوں کا فطری انداز۔ نفسیاتی پہلو۔ جزئیات کا ماہرانہ بیان۔ کردار نگاری اور اُس کے ارتقائی اصول کی پابندی۔ پلاٹ کی دلچسپی کون سی چیز ہے جو اُن میں موجود نہیں۔ طرز بیان جیسا ہے اُس کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک نوعمر زبان میں طرز بیان کی یہ بلندی اور کچھ نہیں تو اعجاز ضرور ہے۔

اس طویل فہرست کے بعد بھی اُردو کے بہت سے افسانہ نگاروں کے نام جان بوجھ کر نظر انداز کر دئے گئے ہیں اور اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو دو ایک برس میں بہت اچھے افسانہ نگار ہو جائیں گے۔ افسانہ نگاری کی یہ روش دیکھ کر دل بے حد خوش ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر یقینی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو افسانہ نگاری بہت جلد

پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔ بعض بعض افسانوں میں اصلاحی رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن اُن کا طرز بیان اسے نمایاں نہیں ہونے دیتا۔ وہ انسان کی فطری کمزوریاں جانتے ہیں اور انھیں کمزوریوں کی وجہ سے جب اُس سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اُس پر طنز کرتے ہیں۔ لیکن طنز میں تلخی نہیں ہوتی۔ خود اُس پر ہنستے ہیں لیکن اس طرح کہ جس پر ہنس رہے ہیں وہ رو نہ دے۔ زبان کی اصلاح کا بے حد خیال ہے چنانچہ ایک افسانے (چہرہ) میں اس مقصد کو نہایت پرلطف طریقہ سے پیش کیا ہے۔

پطرس

پروفیسر بخاری کے مضامین کے مجموعہ کو اب تک مضامین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لوگ اُنھیں افسانے کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ افسانے کی بنیاد عموماً تین چیزوں پر رکھی جاتی ہے۔ پلاٹ کردار اور ماحول۔ بعض افسانہ نگاروں نے ان میں سے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ لیکن اُن کے افسانے ادبی کارناموں میں شمار ہوتے ہیں پطرس کے مضامین میں سے

انسانی فطرت کے مختلف تاریک پہلوؤں کو الفت، علیش، رشک، رقابت، عشق اور اس قسم کے دوسرے جذبات سے متاثر ہوتے ہوئے دکھایا ہے اور ہر موقع پر صرف عورت کی محبت کو ان سب جذبات کا سب سے بڑا محرک قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک عورت کی محبت انسان کو سیاہ کار، بھی بنا سکتی ہے اور نیکو کار بھی۔ اکثر جگہ عابد نے اس پہلو کو نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس میں آرٹ کو اچھا خاصا دخل ہے۔

کہیں کہیں طرز بیان میں پختگی کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اُن کے مخصوص نظریہ حیات نے زیادہ موقعوں پر اس کی پردہ پوشی کی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی

ملک کے مشہور مزاحیہ نگار ادیبوں میں سے ہیں اور اُن کے افسانوں کی دلچسپی زیادہ تر اُن کے طرز بیان اور زبان میں ہے اور یہی عنصر شروع سے آخر تک افسانوں پر چھایا رہتا ہے۔ افسانے میں جب کسی واقعہ کا بیان کرتے ہیں تو اُس کی ساری جزئیات سے اُس میں دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ تکرار سے لُطف پیدا کرتے ہیں اور اس طرح کہ

جلیل کے افسانوں کی بنیاد عموماً نفسیات کے کسی ایک پہلو پر ہوتی ہے اور اس پہلو کو وہ نہایت سادگی، آسانی اور روانی کے ساتھ نمایاں کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اُن کے موضوع کے انتخاب اور اُس کے بیان میں ہر جگہ فطری لچک اور حُسن موجود ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری کے فن سے واقف ہیں اور زبان اور طرز بیان کو اس فن کا مراد سمجھ کر اس میں انتہائی سلاست اور صفائی سے کام لیتے ہیں۔

جلیل کے وہ افسانے جو "سیر گُل" کے نام سے شائع ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر ادبی اور فنّی لحاظ سے 'اصنام خیالی' کے افسانوں سے کہیں بہتر ہیں۔

عابد علی

عابد علی نے افسانے لکھے اور خود اُن کا ماحصل بھی لوگوں کے سامنے بیان کردیا۔ اُن میں کسی اصلاحی مقصد کا خیال نہیں اس لئے کہ اُن کے نزدیک اصلاح اور افسانہ دو منافی چیزیں ہیں۔ اور اصلاح میں کوئی شعریت بھی نہیں۔ عابد علی نے فطرت انسانی کے تاریک پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ سے

جلیل قدوائی

جلیل اُردو کے اُن کامیاب افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو میں ترجموں کے ذریعہ سے اضافہ کرنا شروع کیا۔ انھیں روسی افسانہ نگاروں کے افسانے زیادہ پسند ہیں اور انھیں کے ترجمے زیادہ کئے ہیں خصوصاً چیخوف کو خاص طور پر اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ ترجمے بے حد کامیاب ہیں اور ان میں اصل کا لطف موجود ہے۔

جلیل خود روسی افسانوں کے طرز سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ اُن کے طبع زاد افسانہ بھی اکثر اسی رنگ میں ڈوب کر نکلتے ہیں اور یہ چیز خواہ کسی اور نقطۂ نظر سے بری ہو لیکن اُردو افسانوں کی ترقی کے لئے ایک نیک فال ہے۔ خود اُردو کے لکھنے والے اپنے افسانوں میں بھی مغرب کی بلند فنی نزاکتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر اس میں تھوڑی بہت انفرادیت بھی پیدا ہو جائے تو زیادہ پسندیدہ ہے اور اُس صورت میں یہ تقلید اور اثر ایک بلند چیز ہو جائے۔ ورنہ کہیں کہیں اس اثر کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کے طبع زاد افسانے روسی افسانہ نگار کی فنی اور سحر کارانہ خوبیوں کا ایک بُرا نمونہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ش

انداز بھی ان ماخوذ افسانوں میں طالب کے طبع زاد افسانوں کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ جن میں سے قریب قریب سب کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کو نمایاں کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ کہیں رسم و رواج کی خرابی کی طرف اشارہ ہے۔ کہیں سوسائٹی کی کسی ذہنی اور عملی خرابی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہیں کسی بلند اخلاق کی تلقین کی گئی ہے۔ غرض ہر افسانہ ایک بلند اصلاحی مقصد کا حامل ہے۔

طالب نے افسانوں کی زبان میں روزمرہ اور ستھرے پن کا خیال رکھنے کے علاوہ جس چیز کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے وہ بیان اور خیال کی مناسبت ہے۔ وہ افسانے کے پلاٹ سے تو مختلف اصلاحی مقاصد کا کام لیتے ہی ہیں لیکن طرز بیان میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ اگر یہ افسانے طالب علم پڑھیں تو انھیں زبان کے ستھرے پن اور سادگی کا بھی اچھا خاصا اندازہ ہو جائے۔

ان کے افسانے دلچسپ ہوتے ہیں لیکن ان میں آرٹ کی حیثیت سے کوئی نمایاں بات نہیں۔

"جرنلسٹ" ہونے کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ لیکن اس جرنلسٹ ہونے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ اگر اچھے افسانے لکھنے بھی چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔ چنانچہ اُن کے پچاسوں افسانوں میں سے صرف معدودے چند افسانے اچھے ہیں۔ اور ایسے اچھے ہیں کہ ان سے اسکلم کی فطری افسانہ نگاری کے ذوق کا پتا چلتا ہے لیکن زیادہ تعداد ایسے افسانوں کی ہے، جنھیں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھرتی کے ہیں۔

سید طالب علی

طالب کی فطرت میں شاعرانہ عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے گئے ہیں اور اُن کی ہر ادبی تخلیق میں یہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک شاعر کی طرح محسوس کرتے ہیں اور اُسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ہر جگہ حقیقت کے عنصر موجود ہیں۔ لیکن خشک فلسفیانہ حقیقت نہیں۔

اُن کے زیادہ افسانے ماخوذ ہیں لیکن ان میں بھی اُنھوں نے مقامی رنگ شامل کر کے اُنھیں اپنا بنا لیا ہے۔ بیان اور زبان کا

علیحدہ ہیں۔ اُن کے پلاٹ کے واقعات زیادہ تر مغلیہ شاہزادوں،
شاہزادیوں، یا اُسی عہد کے دوسرے لوگوں کی زندگیوں سے اخذ کیے
گئے ہیں۔ اور ان میں بجائے موجودہ افسانہ نگاری کے فن کے، زیادہ تر
کہانیوں کا لُطف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسری کہانیوں پر جھوٹ
کی رنگ آمیزی ہوتی ہے اور یہ صرف صداقت کے رنگ میں ڈوبی
ہوئی ہیں۔ ان میں مبالغہ نے نہیں، کسی خیالی پلاٹ نے نہیں، بلکہ زندگی کے
ایسے واقعات نے لُطف پیدا کیا ہے جو حقیقت میں ظہور میں آئے تھے۔
خواجہ صاحب کو سُرخیاں تلاش کرنے میں بے حد مہارت ہے
اور اُن کے ان افسانوں کی بڑی دلکشی ان سُرخیوں کے علاوہ
ان کے طرزِ بیان اور زبان میں ہے۔

اسلم

ہماری موجودہ افسانہ نگاری میں جہاں اور بہت سی بُری روشیں
عام ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض افسانہ نگار افسانے
محض اِس لئے لکھتے ہیں کہ انھیں ضرورتاً زیادہ سے زیادہ افسانے
لکھنے پڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اسلم کا نام پیش پیش ہے۔ جو ایک

احمد علی افسانوں میں لطف پیدا کرنے کی کوشش میں غیر منطقی نہیں بن جاتے۔ اور برابر نفسیات سے کام لیتے چلتے ہیں۔ واقعات میں جا بجا مقامی رنگ کی اچھی خاصی جھلک موجود ہے۔ "استاد شمو خاں" اور "تصویر کے دو رُخ"، اس کی نمایاں مثالیں ہیں جہاں ایک خاص قسم کے کرداروں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں اور جو ہندوستان کے ایک آدھ خاص شہر کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی لئے زبان پر بھی مقامی رنگ بے حد نمایاں ہے اور یہ بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔

اُردو کے افسانوں میں دلچسپی اور دلکشی کے نقطۂ نظر سے کافی ترقی ہو چکی ہے۔ اگر ہمارے نوجوان اب فن کی طرف زیادہ توجہ کریں تو ہمارے افسانے دوسروں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ احمد علی کی یہ کوشش محمود اور قابل ستائش ہے۔

حسن نظامی

خواجہ صاحب اُردو کے صاحب طرز ہیں اور زبان کی ایک بالکل نئی روش کے موجد۔ اسی زبان میں آپ نے بہت سے افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہ افسانے موجودہ افسانہ نگاری کی روش سے کسی قدر

زیادہ بلندی نہیں حاصل کرسکے ہیں۔ اس جگہ صرف ایک افسانہ کی مثال دے کر اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی اُن کے افسانے 'اُس کے تحفے' میں جب سروپ شانتی کو اسٹیشن پہنچانے جاتا ہے تو اُسے معلوم ہے کہ وہ اب اُس سے کبھی نہیں ملے گی اور اُسے حاصل کرنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔ اس لئے اُس نے کوشش کرکے اُس کی محبت کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ ان سب باتوں کو افسانہ نگار نے جس طرح بیان کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ کی آخری کڑی نہیں۔ واقعات ابھی اس سے آگے بھی باقی ہیں اور اُن میں صرف اُسی وقت افسانوی دلکشی پیدا ہوسکتی ہے جب خود ہمارا تخیّل کڑی کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

"اور جب وہ اسٹیشن پر اُسے چھوڑنے گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ شانتی کی موجودگی انجن کی اُس آواز کی طرح تھی جو تھوڑی ہی دیر میں کانوں میں بس جاتی ہے۔ لیکن گاڑی روانہ ہوگئی۔ اور پھر وہی سناٹا تھا اور کان انجن کی آواز کو ڈھونڈھ رہے تھے۔"

خاتمہ میں فن کا لطف اُن کے زیادہ افسانوں میں موجود ہے۔ "مہاولوں کی ایک رات"، "اُستاد شمّو خاں"، "تصویر کے دو رخ" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

وہ اپنے ہر افسانہ کے لئے صرف ایک واقعہ، ایک جذبہ، ایک اثر یا ایک چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور اُس چیز یا جذبہ یا واقعہ کو نمایاں کرنے اور اُسے زیادہ فطری بنانے کے لئے اُسکے ساتھ دوسرے ایسے واقعات کا بیان کرتے ہیں جنھیں بظاہر اُس واقعہ سے کوئی ربط نہیں ہوتا لیکن حقیقت میں یا تو وہ اُس مخصوص واقعہ کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتے ہیں یا اُس واقعہ کو زندگی کے واقعات اور فطرت سے قریب بناتے ہیں اور تیسری بات یہ کہ وہ ظاہرا اِن واقعات سے اصل واقعہ کے اثر کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

اتحاد اثر کے قائم رکھنے کی برابر کوشش کرتے ہیں اور اس لئے کبھی کبھی مناظر اور کردار افسانہ کے عالم میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کر کے اثر کو زیادہ کرتے ہیں۔

لیکن ان چیزوں سے کہیں زیادہ وہ جس چیز سے بہت کام لیتے ہیں وہ تصوّر آفرینی ہے۔ سب کچھ خود ہی بیان کر دینا نہیں چاہتے بلکہ زیادہ حصّہ خود لذتِ تخیّل کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ خصوصاً اُن کے افسانے جس طرح ختم ہوتے ہیں اُن میں تصوّر آفرینی بے حد ہے اور فن کے نقطۂ نظر سے یہ چیز اُردو میں قابلِ قدر ہے اس لئے کہ افسانوں کے انجام اُردو کے افسانوں میں اب تک فن کے لحاظ سے

دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شاہد نے جو طریقہ عموماً اختیار کیا ہے وہ زیادہ پسندیدہ اور مفید ہے۔
شاہد کے افسانوں میں فن کے لحاظ سے یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ وہ افسانے کے ہر حصہ میں تناسب کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور بجائے بیجا تفصیلوں کو کام میں لانے کے صرف تصوّر آفرینی سے زیادہ مدد لیتے ہیں۔

احمد علی

احمد علی کے افسانے فن کے نقطۂ نظر سے قابل قدر ہیں۔ اُردو کے بہت کم افسانہ نگار ایسے ہیں جنھیں فن اور اُس کی نزاکت کا شدید احساس ہو۔ وہ افسانہ میں جس چیز کو خود شامل کرنا ضروری سمجھتے ہیں اُسی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ خواہ اُس کی وجہ سے فن پامال ہو جائے۔ اس کی انھیں پرواہ نہیں۔ نوجوان افسانہ نگاروں میں سے احمد علی ہی ایسے ہیں جن کے یہاں اور سب چیزوں سے زیادہ فن کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔
اُن کے افسانوں میں، فن کا پہلا اظہار تو اس بات سے ہوتا ہے کہ

"خوابوں کی بستی اور حقیقت کی دنیا" کو لیں اور ان میں کوئی مکالمہ پڑھنا شروع کر دیں تو ہمیں بے حد لطف آئے گا۔ ان میں زندگی کی اُمنگ، حیات افزا شگفتگی اور سرور آمیز تازگی ملی ہوئی ہے۔ زبان میں دلّی کے روزمرہ کے چٹخارے ہیں اس لئے اور زیادہ مزہ آتا ہے۔ لیکن شاہد نے جہاں کہیں مکالموں میں انگریزی طرز کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اس فطری لوچ میں کمی آگئی ہے۔

شاہد کسی اصلاحی مقصد سے افسانے نہیں لکھتے اور نہ انھوں نے اپنے لئے کوئی خاص طرز اختیار کیا ہے۔ نہ خاص نظریۂ حیات کی ترجمانی کی ضرورت محسوس کی ہے۔ انھوں نے جس چیز کو افسانے کے لئے ضروری سمجھا وہ صرف دلچسپی اور دلکشی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہر جگہ کامیاب ہوئے ہیں۔

شاہد ترجمے کرنے میں بھی مشاق ہیں اور طبع زاد ڈرامے اور افسانے لکھنے کے علاوہ مشہور انگریزی اور روسی افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجمے بھی کرتے ہیں لیکن ان میں عموماً وہ یہ کرتے ہیں کہ پلاٹ لے کر اُسے ہندوستانی فطرت کے مطابق بنا دیتے ہیں۔ ترجموں کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط سمجھ رکھا ہے۔ وہ کسی چیز کو لفظ بلفظ

شاہد عموماً مختصر ڈرامے لکھتے ہیں اور ان میں اس کی بہت اچھی
صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں بھی بعض بعض
ڈرامائی خصوصیات زیادتی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے
اہم چیز مکالمے ہیں۔ افسانوں میں مکالموں سے بے حد کام لیتے ہیں
اور قریب قریب سارے واقعات اور پلاٹ کے خاص خاص نکات
پڑھنے والوں کو انھیں مکالموں کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔
آئندہ آنے والے واقعات کا علم، گذشتہ واقعات کی تصور زا تفصیلات،
جذبات کی مصوری، پلاٹ کی ترتیب اور کردار کی فطرت نگاری کا کام
ہر موقع پر انھیں مکالموں سے لیا جاتا ہے۔ اس طرح فنی نقطۂ نظر سے
مکالموں کو ان کے افسانوں میں کافی اہمیت حاصل ہے لیکن جو چیز
ہمیں خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان مکالموں
کی شگفتگی، تازگی اور فطری لوچ ہے۔ بہت کم افسانہ نگاروں کے مکالمے
اس قدر دلچسپ اور شگفتہ ہوتے ہیں جتنے شاہد کے۔ اس کی وجہ عموماً
تو یہ ہوتی ہے کہ وہ مکالموں میں جن کرداروں کی گفتگو پیش کرتے ہیں وہ ان کی
فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کردار عموماً طبعاً شوخ اور شریر
ہوتے ہیں اور ان کی معمولی باتوں میں بھی لطیفوں کا لطف ہوتا ہے۔
مثال کے لئے ہم اگر اُن کے افسانوں میں سے "تقلید شباب"، اور

الفاظ میں وہی زور اور اثر، پلاٹ میں وہی کشش اور کیف، فن میں وہی لطف اور نزاکت۔ ہماری زبان کو ایسے ترجمہ کرنے والوں کی سخت ضرورت ہے جو دوسرے ادیبوں کی بلند تخلیقوں کو بالکل اسی شکل میں اُردو میں منتقل کر سکیں۔

حامد علی خاں کے افسانوں کا انتخاب زیادہ تر حزنیہ ہوتا ہے لیکن اس انتخاب میں حزن کو بھی اُسی حد تک دخل ہے جہاں تک وہ افسانہ کو فن کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ بلند بنانے میں مدد دیتا ہے۔

حامد علی خاں کے افسانوں کی ایک اہم اور قابل قدر خصوصیت اُن کی زبان ہے۔ جس میں وہ نئے نئے لفظوں سے اپنے ہر خیال اور حس کو ہمارے ذہن تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لفظوں کی آوازوں اور اُن کی نشست سے کہی ہوئی بات کا مفہوم خود بخود ذہن میں آ جاتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی

شاہد کی ہر چیز میں خوش مذاقی کو دخل ہے۔ اس لئے اُن کے افسانوں پر مجموعی تنقید کرتے وقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں بھی خوش مذاقی اور شگفتگی کو بے دخل ہے۔

کرتے ہیں لیکن ایک بات ہرایک میں موجود ہے۔ ان میں جذباتی رنگ کو کافی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ افسانوں کے کردار ہمیشہ تحریکات کے شدید اور مختلف جذبات میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کا کوئی افسانہ اس سے خالی نہیں۔

بیان ہمیشہ افسانہ کے عالم کا تابع رہتا ہے۔ اس لئے الفاظ کا انتخاب بے حد موزوں کرتے ہیں۔

حامد علی خاں

حامد علی خاں نے طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں اور ترجمے بھی کئے ہیں۔ لیکن اُردو کی صحیح خدمت وہ ترجموں سے انجام دے رہے ہیں۔ ترجمے کرنے کی اُن میں فطری صلاحیت ہے اور اس لئے اُنھوں نے دوسری زبانوں کے جو ترجمے اُردو میں کئے ہیں وہ بے حد قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ خصوصاً بنگالی افسانوں کے بہترین ترجمے ہمیں انھیں کے یہاں ملتے ہیں۔ اور ان ترجموں کو پڑھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خود افسانہ کا اصل مصنف کسی اعجاز سے اپنے فطری خیالات کو بجائے بنگالی یا انگریزی کے اُردو میں ادا کر رہا ہے۔

اختیار کرنا پڑے گا۔ افسانوں کے عالم اور اُس کی اسپرٹ میں ملکی خصوصیات کے علاوہ خود مصنّف کی ذہنیت کا اچھا خاصا عکس ہوتا ہے۔ اور اس لئے ہر ملک اور ہر مصنّف کے افسانوں کا انداز بھی قریب قریب جدا گانہ۔ منصور احمد کے مترجمہ افسانوں میں سے کسی پر نہایت سنجیدہ اور متین پہلو چھایا ہوا ہے۔ کوئی شروع سے آخر تک شوخ اور لطیف ظرافت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کسی پر رومانی اثرات کا سایہ ہے اور کسی کو شاعرانہ فطرت نے شروع سے آخر تک گھیر رکھا ہے۔ لیکن ترجمہ پڑھنے کے بعد ذرا سی دیر کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ افسانہ کی اسپرٹ میں کوئی فرق آگیا۔ ترجمہ کی یہ بہت بڑی صنعت ہے کہ اُس کے عالم اور اُس کی روح کو برابر قائم رکھا جائے اور پڑھنے والا اُس میں اصل کا لُطف لے سکے۔ منصور احمد نے باوجود مختلف قسم کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کے اس حُسن کو بہت اچھی طرح نباہا ہے۔ اور ان میں ہر جگہ اصل کا انداز، وہی لطف، وہی کیف وہی نظریۂ حیات، اور وہی عالم موجود ہے۔ باغی، لولو کی فتح، ایک رومان، خواب حشر، اوتائی کی کہانی، آفتاب پرست، سب مختلف فضاؤں میں لکھے ہوئے مختلف مصنفین کے افسانے ہیں اور سب کا انداز الگ ہے۔ اور ترجمہ میں یہ انداز ہر جگہ الگ معلوم ہوتا ہے۔ منصور احمد گو مختلف قسم کے افسانوں کا انتخاب اپنے ترجموں کے لئے

بھی ہیں۔ لیکن طبع زاد افسانے وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے لکھتے ہیں اس لئے اُردو کی زیادہ بڑی خدمت یہ طبع زاد افسانہ ہی لکھ کر سکتے ہیں۔ اگر فضل حق اپنا نظریۂ حیات کسی قدر اور بلند کر لیں تو بہت جلد اُن کا شمار اُردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگے۔

منصور احمد

منصور احمد نے بھی طبع زاد افسانے بہت کم لکھے ہیں۔ زیادہ تر ترجمے ہیں۔ لیکن اُن کے ترجموں کا انداز دوسرے ترجمہ کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ سجاد حیدر، نیاز اور حامد علی خاں نے جو ترجمے کئے ہیں اُن میں انفرادیت موجود ہے۔ ان سب نے اوّل تو اپنے اپنے لئے ایک مخصوص انداز کے افسانوں کا انتخاب کر لیا ہے اور اُسی انداز کے افسانوں کا ترجمہ کیا اور اِسے ہر جگہ اپنے خاص رنگ میں کامیابی کے ساتھ نبا ہا ہے۔ منصور احمد میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے افسانوں کے ترجمے کرتے ہیں کبھی انگریزی، کبھی فرانسیسی۔ کبھی روسی، کبھی جاپانی اور کبھی جرمنی۔ ان سب افسانوں کا انداز ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گا اور ان کے مترجم کو ہمیشہ ایک نیا اندا

ہندوستانی گھروں کی شریف عورت باوجود اپنی کمزوریوں کے کس قدر نیک، بھولی، شریف النفس، محبت کی دیوی اور ایثار کا مرقع ہوتی ہے۔ اس کی سادگیوں میں ہزاروں محاسن بکھرے ہوئے ہیں اور حقیقتاً اس کی کمزوریاں ہی کبھی کبھی ایک بہت بڑی خوبی سے بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

فضل حق کا طرز بیان شگفتہ ہے۔ اور اس میں جگہ جگہ لطیف مزاح اور ہلکی ظرافت کی چاشنی، افسانوں میں ایک خاص حسن اور دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اور پڑھنے والا ایک معمولی سے واقعہ میں بے حد دلچسپ افسانے کا لطف محسوس کرتا ہے۔ ہماری زندگی کی بالکل حقیقی تصویریں، جن میں کسی قسم کی بناوٹ، تصنع یا ادبی بلندی کے شامل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی طرز بیان کی وجہ سے افسانہ کو بلند بنا دیتی ہیں۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں معدودے چند افسانہ نگار حقیقت شعار ہیں اور اُن میں سے بھی زیادہ ایسے ہیں جنھوں نے حقیقت شعاری کو برابر رومان، شاعری یا تخیل کی مدد سے زیادہ ادبی بنانے کی کوشش کی ہے۔ فضل حق بلا اس کوشش کے بھی اچھے افسانہ لکھ سکتے ہیں اور یہ اُن کی امتیازی شان ہے۔ آج کل فضل حق ترجموں کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ اور اس میں کامیاب

سوسائٹی کے طرز معاشرت اور اُس کی فطرتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص اگر اُس مخصوص زندگی یا سوسائٹی کے متعلق کچھ لکھے گا تو اُس میں حقیقت کا عنصر ضرور غالب ہوگا۔ فضل حق نے مسلمانوں کے شریف گھروں کی حالت کو بغور دیکھا۔ اُس کے ہر پہلو کا مطالعہ عمیق نظر سے کیا اور اُس کی چھوٹی سی چھوٹی بات کو اپنے مشاہدہ کی مدد سے اپنے ذہن کا ایک جزو خاص بنا لیا۔ اور اُس کے بعد ان کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانے کا پلاٹ بنایا۔ ان میں کہیں عورتوں کی مخصوص ذہنیتیں۔ اُن کی فطری کمزوریاں۔ زرا زرا سی بات میں شک۔ شبہہ اور وہم کا پیدا ہو جانا۔ محبت میں پیش قدمی کرنا اور اُسے توڑنے میں اُس سے زیادہ آگے رہنا۔ بات بات میں غلط فہمیوں کا شکار ہونا۔ اُنھیں رائی کا پربت بنا لینا ان سب باتوں کا ذکر ہر جگہ پُر لطف طریقے سے ہوا ہے۔ شریف گھروں کے لوگ اپنے بچوں سے، اپنی بیوی سے، بہن، ماں اور بھاوج سے کس کس طرح ملتے ہیں اُن کے مختلف طریقوں اور برتاؤ میں کیا کیا فرق ہوتا ہے اُن سب باتوں کا ذکر فضل حق کے افسانوں میں نہایت حُسن کے ساتھ ہوا ہے اور ہمارے سامنے یہ افسانے ان گھروں کی حالت کے سچے مرقعے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔

اُس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہر موقع پر یہ دکھایا ہے کہ

اس میں شک نہیں کہ بلند مضامین بلند الفاظ کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے لیکن اگر ان بلند مطالب کو آسان زبان میں بیان کیا جا سکے تو زبان اور قوم کی زیادہ بڑی خدمت ہے۔

قیسی کے افسانے پلاٹ کی ترتیب اور اُس کی فنی ترتیب کے لحاظ سے بھی بے حد کامیاب ہیں۔

اُن میں کردار نگاری کے بلند اور فطری نمونے بھی کافی تعداد میں پیش کئے گئے ہیں۔ عشقیہ افسانوں میں اس کی مثالیں زیادہ ہیں اور پڑھنے والے کے لئے لُطف اور دلچسپی سے خالی نہیں۔

قیسی میں آئندہ زمانے میں اُردو کے بہت کامیاب افسانہ نگار بننے کی صلاحیت ہے اور نوجوان لکھنے والوں میں ان کے طبع زاد افسانے اب بھی ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔

فضل حق قریشی

فضل حق قریشی کے افسانے دیکھ کر ایک انگریز نقاد کا مقولہ یاد آتا ہے " ہر شخص اپنی عمر میں کم از کم ایک اچھا ناول ضرور لکھ سکتا ہے" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی مخصوص

لیکن دلچسپ رنگ چھایا رہتا ہے۔ فطرت انسانی میں جتنی برائیاں ہیں وہ اُنھیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے لیکن خدا کو ان سب کا خالق سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آرزوؤں کا پیدا ہونا۔ خود غرضی، کاہلی، عمل سے بھاگنا۔ یہ سب چیزیں خدا نے کسی نہ کسی حد تک فطرت انسانی میں پیدا کی ہیں، اس لئے اُن کا قطعی مٹ جانا تو ممکن نہیں۔ لیکن ہاں انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ انھیں فطری حدود سے باہر نہ جانے دے۔ اُنھیں اپنے اختیار میں رکھے۔ خود اُن کا محکوم نہ بن جائے اور عمل کے میدان میں گامزن ہو۔ یہ سب باتیں جو اُن کے بلند نقطۂ نظر کی حامل ہیں اور جن سے اُن کے نظریۂ حیات کا پتا چلتا ہے، نہایت دلچسپ طریقے سے افسانوں کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن جہاں کہیں وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار لفظوں میں یا اپنے کرداروں کی زبان سے کروانے کی کوشش کرتے ہیں وہاں پڑھنے والا اُلجھن محسوس کرنے لگتا ہے اور مجنوں کے افسانوں کی طرح ان کے یہاں بھی ذراسی خیالی آزادی سلب ہوتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔

قیسی کے بیان میں کشش ہے اُن کے پاس اپنے بلند خیالات کے اظہار کے لئے لفظوں کا خزانہ ہے لیکن کبھی کبھی طرز بیان پر عربی فارسی اس قدر مسلط ہو جاتی ہے کہ اُردو ایک معمہ بن کر رہ جاتی ہے

لیکن افسانوں میں اس مقصد کا اظہار اس قدر نمایاں ہے کہ اُن میں افسانوی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ نہ فن کی نزاکتوں اور بلندیوں کا پتا ہے۔

کردار نگاری کی خوبیاں افسانوں میں کہیں کہیں موجود ہیں اور مولانا نے ہمارے سامنے عورتوں کے مثالی کردار پیش کر کے ہمیں اُن کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے کہیں کہیں افسانوں میں منتہا کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان بہت صاف، سادہ اور موثر لکھی ہے اور حقیقت میں افسانوں میں یہی چیز نمایاں نظر آتی ہے اور اُن میں جابجا ادبی لطف اور زبان کے چٹخاروں سے مزا پیدا ہو جاتا ہے۔

قیسی رامپوری

قیسی انسان کے تمام افعال اور جذبات کو ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے افسانوں میں ان مشاہدات یا تخئیلات پر گہرے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہیں۔ اُن کی تخئیل سلجھی ہوئی اور بلند ہے۔ اس لئے افسانوں پر عموماً ایک فلسفیانہ

ان افسانوں کو بھی اُردو کے موجودہ دور ترقی کے لحاظ سے کوئی بلند جگہ نہیں دی جاسکتی۔

راشد الخیری

راشد الخیری ملک کے مشہور ادیب اور صاحب طرز ہیں۔ ان کے مخصوص طرز کے ناول اُردو میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں جو مقصد اور طرز نمایاں ہے اُسی طرز کے اُنھوں نے بہت سے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی عام طور پر وہی انداز موجود ہے جو ناولوں میں ہے۔ آپ نے ان میں عورتوں کی معاشرت شریف ہندوستانی گھروں کی بہو، بیٹیوں اور بڑی بوڑھیوں کی مخصوص فطرتیں افسانے کی شکل میں پیش کی ہیں اور ہر موقع پر لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ عورتیں سوسائٹی کے ہاتھوں جن تکلیفوں اور حق تلفیوں کی شکار ہو رہی ہیں اُس سے اُنھیں بچایا جائے۔ عورت کے سارے حقوق اُسے دے دئے جائیں۔ اور ہم صحیح طریقہ سے اُس سے محبت کرنا سیکھیں اس لئے کہ مرد کی توجہ اور محبّت ہی عورتوں کو اُن کی فرض کی ادائیگی کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل کر سکتی ہے۔ مقصد بہت بلند ہے

برابر اس کے مزے لیتا ہوا چلتا ہے لیکن اصلاح کا خیال اس قدر نمایاں ہے کہ افسانوی دلکشی اور کیفیت قطعی باقی نہیں رہتا۔ افسانوں میں اصلاح کا جذبہ جب نمایاں ہو جاتا ہے تو نہ افسانہ کا لطف باقی رہتا ہے نہ اصلاحی مقصد کی تکمیل ہوتی ممکن نظر آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے افسانے دلچسپ اور شاعرانہ لکچر ہیں جن میں نہ لکچر کا لطف ہے نہ شاعری کا۔ نہ خشک فلسفہ کی گہرائیاں ہیں، نہ شاعری کی لطیف نزاکتیں اگر زبان میں اتنا لطف نہ ہوتا تو شاید افسانہ پڑھنے والا ان میں ذراسی دیر کو بھی دلچسپی نہ لے سکتا۔

البتہ اُن کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اُس کے افسانے فن کے لحاظ سے بھی اچھے خاصے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں افسانہ نگار نے ایک ہی جذبہ یا عالم کی ترجمانی کی ہے اور اُس کے مختلف حصّوں کو اسی عالم کا تابع رکھا ہے اصلاحی مقصد کے بجائے افسانوی دلچسپی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور ان میں نفسیات کے اہم پہلوؤں پر نظر رکھکر افسانہ نگاری کا حُسن پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس مجموعہ کے افسانوں میں "ہاں نہیں"۔ "خواب و خیال" اور "عالم ارواح" ایسے افسانے ہیں جن میں فسانۂ جوش کی اصولی اور فنی کمی بڑی حد تک پوری ہوئی ہے۔ طرزِ بیان میں بھی شگفتگی اور کیفیت ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت

ہندوستانیوں کو، اُنکے طور طریقوں کو اُن کے طرز معاشرت، اُن کی تہذیب و تمدّن کو ایک پرشور دریا کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ ہر طرف مغرب کی تقلید کا اثر چھایا ہوا تھا۔ شاعروں نے اس کی روک تھام کی کوشش شروع کر دی تھی لیکن افسانہ نگاری میں اس روش کی بنیاد جوشؔ نے ڈالی اور اپنے افسانوں میں مغربی تقلید پر نہایت آزادانہ اور بے باکی سے تنقید شروع کی۔ تقلید کے دیوانوں کے سامنے افسانہ کی شکل میں ایسے واقعات پیش کئے جو مغرب کی تقلید میں کئے گئے تھے اور اُن کا نتیجہ نہایت مہلک ثابت ہوا۔

جوشؔ کا طرز بیان طنزیہ اور مزاحیہ ہے اس لئے اصلاحی مقصد کے لئے بے حد موزوں تھا۔ وہ واقعات کے درمیان میں برابر طنز سے کام لیتے جاتے تھے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں چٹکیاں لے لے کر اُنھیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

بیان میں زور، زبان کا لطف، روزمرہ کا چٹخارا، اور استہزا ء کی لطیف چاشنی بے حد مزہ دیتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"تارے۔ شب تار کی بے شمار چمکتی ہوئی آنکھیں۔ گھٹا ٹوپ خلا میں گھی کھچڑی ہو کر جگمگا رہے تھے"

غرض طرز بیان کی دلکشی تو ان کے یہاں بہت ہے اور پڑھنے والا

احساس شدت سے ہے اور اس لئے اس کا عکس ان کے افسانوی کرداروں میں کسرت سے پایا جاتا ہے۔ وہ اس ذہنی پستی کو دور کرنا چاہتے ہیں اور افسانے کے درمیان میں نہایت شگفتہ طریقہ سے ایک سنجیدہ ظرافت کے ساتھ اُس کا اظہار کر دیتے ہیں۔

اُردو کے افسانوں میں مقامی رنگ جس جس طرح پیش کیا گیا ہے اُس سے ہندوستانیوں کی ذہنی ترقی یا تنزل کا پتا کم چلتا ہے۔ اکثر کے افسانوں میں مقامی رنگ کی جھلک نہ مناظر کی شکل میں ہے نہ طرزِ معاشرت اور رسم و رواج کی صورت میں۔ اگر ہے تو اس طرح کہ اس سے ہم ہندوستانی کے دماغ اور فطرت کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اس فطرت کو دور سے پہچان سکیں جو ہندوستان والوں کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ ان کے افسانے "لاٹری کا روپیہ"، "بانو لزلہ" اس قسم کی اچھی مثالیں ہیں۔

سُلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش اُردو کے بہت پُرانے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی افسانہ نگاری کی عمر قریب قریب ۳۰ سال کے ہے۔ جس زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے افسانہ نگاری شروع کی تو مغربیت کا سیلاب

مدارج انسان میں کیا کیا تبدیلیاں کردیتے ہیں اور اُسے عام فطرتِ انسانی سے کسی قدر مختلف بنا دیتے ہیں۔ انسانی فطرتوں کا تنوع مختلف لوگوں کی مختلف اچھائیاں اور بُرائیاں فطری کم ہوتی ہیں اور دُنیا کے واقعات کا ان میں زیادہ گہرا رنگ ہوتا ہے افسرؔ ان سب چیزوں کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اور ان سے گہرا اثر لیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے افسانے کی بنیاد صرف ایک جذبہ، خیال یا نفسیاتی یا ڈرامائی واقعہ پر رکھتے ہیں اور آخر تک اس چیز کا افسانہ میں شدید احساس رکھ کر اس میں اتحادِ اثر پیدا کرتے ہیں۔ معمولی سے معمولی واقعات کو اہم نفسیاتی پہلو سے دیکھنے کے بعد اُن میں خاص بلندی پیدا ہو جاتی ہے اور اس بلندی کا مظاہرہ افسرؔ کے افسانوں میں زیادہ ہے۔

کرداری ارتقا کی جتنی سچی تفسیریں افسرؔ کے افسانے ہیں دوسرے افسانہ نگاروں کے کم ہیں۔ انسان کی فطرت دنیا کے ماحول اور اپنے گردوپیش اور واقعات کی تبدیلیوں سے وقتاً فوقتاً متاثر ہوتی رہتی ہے اور آخر اس میں ایک فوری انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اس کا احساس افسرؔ نے زیادہ کیا اور اس لئے یہ جذبہ اُن کے افسانوں میں کافی جگہ موجود ہے۔

افسرؔ کے افسانے ایک نظر سے اصلاحی بھی کہے جا سکتے ہیں لیکن اس اصلاح کا انداز کسی قدر جداگانہ ہے۔ افسرؔ کو ہندوستانیوں کی ذہنی پستی کا

سب سے زیادہ حسین سمجھتا ہے کبھی صرف عورت ہی کی وجہ سے وہ
گناہ کی تاریکیوں سے باہر نکل آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی عورت
کے متعلق اُن کے جذبات زیادہ تر رومانی ہیں۔ وہ دنیا کی ہر لذت کو
"مکروہ۔ ٹھوس اور ناجائز" سمجھتے ہیں اگر عورت کا وجود نہ ہو۔ عورت اُن کے
نزدیک مسیحا ہے۔ ہر تکلیف کو دور کرنے کا مرہم اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کا
نغمہ سحر موسیقی، اور اُس کی ہر جنبش شعر کی لطیف کیفیتوں کی حاصل۔
لیکن ان سب سے زیادہ یہ کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں وقت اور
موقع کی تلاش نہیں کرتی۔ اُس کی ہر ادا ایک طلسم ہے لیکن روحانی،
پاک اور بلند۔

احمد شجاع کے افسانوں میں اندھا دیوتا "گناہ کی رات، حُسن کی
قیمت"، اور آرام شاہ کی بیٹی بلند پایہ کے افسانہ ہیں۔

حامد اللہ افسر

افسر کی مخصوص فطرت ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا
مطالعہ برابر کرتے رہتے ہیں۔ مذہب۔ دولت۔ غریبی۔ غصہ۔ غم اور
اس قسم کے دوسرے جذبات اور سماجی انقلابات اور سوسائٹی کے

احمد شجاع کے قریب قریب سب افسانے اصلاحی ہیں۔ اُن میں سوسائٹی کے کسی نہ کسی عیب کی اصلاح منظور ہے لیکن بھونڈے طریقے سے نہیں ہے وہ عموماً اپنے کرداروں کو بُرے افعال اور گناہوں میں مبتلا ہوتا ہوا دکھاتے ہیں۔ یا فطرت انسانی کے تاریک پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتے ہیں اور اُس کے بعد ان پر یا تو خود اپنے لفظوں سے یا خود اُن کے عمل سے خود تنقید کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو ایک بُری چیز کا شدید سے شدید احساس ہو جائے اور اُس کے بعد وہ اُسے چھوڑنے پر مجبور ہوں۔ وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتے کہ تم فلاں چیز کو چھوڑ دو اور فلاں کو اختیار کرو، بلکہ اُن کا طریقہ صرف یہ ہے کہ جن چیزوں کو اُن کی نظر نے معیوب جانا ہے اُنھیں افسانہ کے دلچسپ پیرایہ میں پیش کر دیا۔ ڈرامائی اثرات سے لوگوں پر بھی وہی جذبہ طاری کر دیا جو خود اُن پر ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس طرح کہتے ہیں کہ سُننے والے کے دل پر اُس سے چوٹ لگتی ہے۔ اُس کے جذبات میں یکبارگی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی افسانہ نگار کی کامیابی کا راز ہے۔

احمد شجاع کے افسانوں میں عورت اور اس کی فطرت کو بے حد دخل ہے۔ اس لئے ہر افسانہ میں وہ عورت کو ایک نمایاں درجہ دیتے ہیں۔ کبھی اس کی وجہ سے انسان گناہ اور عذاب کے تصوّر کو

کبھی کبھی یہ جذبہ اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک قسم کی قید سی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فن کے نزدیک یہ چیز بہت محمود ہے لیکن اس کا شدید استعمال کبھی کبھی اسے بُرا بنا دیتا ہے۔ تاہم مجموعی حیثیت سے ہم بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ احمد شجاع نے اس طریقہ کو کام میں لا کر افسانہ نویسی کے فن میں حُسن اور جدت کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے اُن کے افسانوں میں کوئی کمی نہیں بلکہ بلندی پیدا ہوئی ہے۔

کردار نگاری کے معاملہ میں بھی احمد شجاع نے ڈرامائی طریقہ کو پسندیدہ سمجھا ہے اور اپنے کرداروں کو عموماً اُن کے عمل اور گفتار کے ذریعہ سے روشناس کرایا ہے۔ اُن پر جا بجا گہرا اثر دکھا کر انہیں نفسیات کے کسی نہ کسی گہرے اضطراب میں مبتلا کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور پھر اس اضطراب اور ہیجان کو دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی معقول وجہ پیش کر کے اُسے اس سے رہائی دلائی ہے۔

احمد شجاع کا خیال ہے کہ افسانہ نویس کا کام فقط مصوری اور شاعری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جا بجا اپنے افسانوں میں ان چیزوں کو کام میں لائے ہیں خصوصاً نتائج کے پیش کرتے وقت مصوری سے اور جذبات کے بیان میں برابر شاعری سے کام لیا ہے۔

افسانہ نگار نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے کسی لفظ، خیال یا جذبہ کو اس "گناہ کی رات" کے تصوّر سے علیحدہ ہونے دے۔ اسی جذبہ کی تکرار سے ڈرامائی اثر اُس میں برابر ارتقا پیدا کرتا چلا گیا ہے اور اس لئے اثر اپنی پوری قوت اور گہرائی کے ساتھ پڑھنے والے کے دل پر قبضہ کئے رہتا ہے اور افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی اُس کا تصوّر یکبارگی دور نہیں ہو جاتا۔

ڈرامائی اثر پیدا کرنے کی جو ترکیب عموماً احمد شجاع نے استعمال کی ہے وہ لفظوں کی تکرار ہے۔ وہ ایک ہی خیال کو مختلف طریقوں سے، مختلف لفظوں میں، مختلف تمثیلوں کے ساتھ، بیان کرتے ہیں تاکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں جو موقع وہ پیش کر رہے ہیں خواہ وہ نفسیاتی ہو خواہ محض بیانی، اُس کا اثر زیادہ سے زیادہ پڑے۔ ڈرامہ نگار کو اتحاد اثر سے زیادہ اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کو چھوڑ کر ذرا سی دیر کو بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔ حالانکہ اچھے افسانہ نگار باوجود اس علیحدگی کے اپنے افسانوں میں اثر پیدا کر سکتے ہیں لیکن احمد شجاع ذرا سی دیر کے لئے بھی اپنے آپ کو اسکا عادی نہیں بنانا چاہتے۔ وہ اشارتاً بھی اپنے اصل موضوع کے علاوہ پڑھنے والے کو دوسرے خیال کی طرف لے جانے کو عیب سمجھتے ہیں۔

انتخاب اور اُن کا استعمال اس قدر موزوں ہوتا ہے کہ کسی طرح انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے اُن کے افسانے سارے افسانوں پر سبقت لے گئے ہیں۔

احمد شجاع

احمد شجاع حقیقت میں ڈرامسٹ ہیں۔ اُن کے ڈراموں میں ڈرامہ کے فن کے علاوہ ادبیت بھی زیادہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ ادبی ڈرامے کامیابی سے لکھ سکتے ہیں۔ یہی دو نوں چیزیں ہیں جو ہر موقعہ پر اُن کے افسانوں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اتحادِ عمل اتحادِ زبان و مکان کے علاوہ جو چیز اُن کے افسانوں میں فنی شان اور بلندی پیدا کرتی ہے وہ اتحادِ اثر ہے۔ وہ افسانہ شروع کرتے وقت اور اُسے شروع کرنے کے بعد جس جذبہ یا تحریک سے متاثر ہوتے ہیں، اُسے وہ آخر تک نہایت شدّت سے قائم رکھتے ہیں۔ اتحادِ اثر کی بہترین مثال اُن کا افسانہ "گناہ کی رات" ہے۔ سُرخی سے لے کر اُس کے خاتمہ تک افسانہ پر، افسانہ نگار پر اور اُن سب سے زیادہ افسانہ پڑھنے والے پر اُس کا یکساں اثر قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

وہ اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ نہ شاعر کی طرح جذبہ نگاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ مصلح کی طرح لوگوں کے مصائب کا علاج تلاش کرنے میں سرگرداں۔ وہ صرف افسانہ گو ہیں۔

اعظم کے بعض افسانوں میں پلاٹ ملکی سیاست کے مختلف پہلوؤں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اوران سیاسی خصوصیات کو پلاٹ کا پس منظر بنا کر کردار نگاری کے بلند نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوراس میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

ان کے بعض افسانے عشقیہ ہیں لیکن ان کا مقصد بھی عموماً کردار نگاری ہے۔ عشق ایک کسوٹی ہے جہاں آکر انسان کی فطرت اور اس کے کیرکٹر کے بلند اور پست پہلوؤں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اعظم کے افسانوں کی جان ان کی زبان ہے۔ اردو کو اس وقت جس خدمت کی ضرورت ہے وہ افسانہ نگاروں میں اعظم سے زیادہ کوئی اور انجام نہیں دیتا۔ پریم چند۔ سدرشن۔ حسینی سب دیہات کی زندگی کے نقشے کھینچتے ہیں۔ ہندوستان والوں کی گفتگوئیں اور مکالمے دکھاتے ہیں۔ لیکن زبان کسی کے یہاں اتنی فطری نہیں جتنی اعظم کے افسانوں میں۔ وہ فارسی اور ہندی کے صرف ایسے لفظ ایک جگہ استعمال کرتے ہیں جو اکمل بے جوڑ نہ معلوم ہوں۔ ہندی اور فارسی لفظوں کا

- لیکن پریم چند کی طرح وہ دیہاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کرتے - بلکہ اُن میں سے چند ایسے واقعات کا انتخاب کر لیتے ہیں جن کے بیان میں اُن کے نزدیک اثر زیادہ ہے یا جن کے بیان سے افسانے میں فطری پن زیادہ سے زیادہ پیدا ہو سکتا ہے - لیکن ان واقعات کے انتخاب سے پتا چلتا ہے کہ وہ دیہات کی زندگی اور اُس کی ساری تفصیلوں سے اچھی طرح واقف ہیں - اُنھوں نے دیہاتوں کے گھروں کے اندر اور باہر اچھی طرح سیر کی ہے - اُن میں دن گذارے ہیں، اُن کی زندگی کی شدید تکلیفوں اور مصیبتوں سے واقف ہیں - اُن کے جذبات اور خیالات کا اندازہ اچھی طرح کیا ہے - اُن کے رسم و رواج، طور، طریقوں میں سے کوئی ایسا نہیں جس سے وہ بے خبر ہوں - اُنھیں ہندوستان کی سیاسی فضا میں صرف ایک شدید کمی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں کوئی امیر ہے، کوئی غریب - کسی کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اُس کے مرنے کے بعد سانپوں کے پھنوں کے نیچے دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی پیٹ کی آگ میں جل جل کر اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے - اعظم کے افسانوں سے ان سب باتوں کا پتہ ضرور چلتا ہے لیکن وہ خود اپنے جذبات سے قطعی کام نہیں لیتے ایک افسانہ گو کی طرح واقعات کی حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کر دینے کو

عموماً یا تو مکالموں کے ذریعہ سے ظاہر کرتے ہیں اور یا اس سے زیادہ خود اُس گفتگو سے جو کردار تنہائی میں اپنے آپ سے کرتے ہیں۔

حسینی کا نظریۂ محبت عام محبت سے کسی قدر جداگانہ اور فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت پہلی نظر میں پیدا نہیں ہوتی۔ اگر یہ جذبہ پہلی نظر میں شروع ہو جائے تو اس کی ترقی کے کافی وجوہ ہونے چاہئیں۔ اس میں آگ بھڑکانے کے لئے برابر تحریکات کا عمل ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کی محبت اُن کے افسانے "سوتیلے" میں موجود ہے۔

حسینی کے افسانے مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور موثر ہوتے ہیں۔ اُن میں فن کے محاسن کے علاوہ زبان اور بیان کی دلکشی بھی حد درجہ موجود ہے۔ اُن کے افسانوں میں سب سے اچھے "رفیق تنہائی" "بہو کی ہنسی" "سکھی" اور "بوڑھا اور بالا" ہیں۔

اعظم کریوی

اعظم کریوی اُن کامیاب افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے صرف مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کی خاص دلکشی بنا رکھا ہے۔ اُن کے ابتدائی افسانے اور اُن کے پلاٹ عموماً دیہات کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے

ان دونوں کی بُنیاد ایک ہی نفسیاتی پہلو پر رکھی گئی ہے اور وہ پہلو یا جذبہ افسانہ پر شروع سے آخر تک چھایا ہوا ہے۔ نفسیات کا عمل حسینی کے افسانوں کے اُن حصوں پر زیادہ نظر آتا ہے جہاں کوئی جذبہ اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا ہے اور جس جگہ وہ انسان کے دل پر زیادہ سے زیادہ اثر کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر حسینی اس جذبہ کو صرف لفظوں کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ شدید بناتے ہیں اور اُس کے بعد اسے دیر تک نہیں قائم رہنے دیتے ورنہ یہ درد یا تڑپ زیادہ حزنیہ بن جائے۔ کبھی کبھی افسانہ ختم کرتے وقت اُس میں اپنی رائے شامل کر دیتے ہیں اور اس سے ان کے نقطۂ نظر کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اس رائے میں عموماً جو چیز زیادہ حُسن کی ہے وہ اُس کی تصور آفرینی ہے وہ افسانہ کے مختلف ٹکڑوں کو ہمیشہ اسی جگہ ختم کرتے ہیں اور اس طرح ختم کرتے ہیں کہ ہمارا ذہن آئندہ کے واقعات کا اندازہ لگا سکے۔

حسینی کے کردار شروع سے آخر تک ارتقا کی ساری منزلیں طے کرتے ہیں اور آخر میں ایک ایسے موقع پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ افسانہ کے پلاٹ، اُس کے عالم اور مصنف کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نظر آئیں۔ حسینی اپنے کرداروں کے خیالات اور اُن کے تحریکی جذبات کو

اور دشواریوں کو اُنھوں نے اپنے افسانے کا موضوع نہیں بنایا۔ پریم چند کی طرح اِن حالات کو نمایاں کرنا اُن کا اصل مقصد بھی نہیں۔ وہ دیہاتی زندگی کے کسی پہلو سے اپنا پلاٹ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اُس کی تفصیلات میں ہرگز نہیں پڑتے، وہ دیہاتیوں کی مادّی زندگی کے یا جسمانی تکالیف کو نمایاں نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اُن کے اندرونی جذبات کو، اُن جذبات کو جو ہر انسان کے لئے عام ہیں ہم تک پہونچانا چاہتے ہیں اور محض اس لئے کہ اِن کے شدید احساس سے ہم میں درد۔ اور تڑپ کا جذبہ پیدا ہو لیکن مقامی رنگ کے افسانوں میں ایک چیز جو پریم چند کے یہاں بھی نہیں اُس سے حسینی نے نہایت حسن سے کام لیا ہے۔

پریم چند نے دیہاتی زندگی کے افسانوں میں وہاں کی خاص بولی کبھی نہیں لکھی۔ حسینی نے "سوبیگھے" اور "سکھی" میں اس کا کافی استعمال کیا ہے اور نہایت سلیقہ کے ساتھ۔

حسینی کے افسانوں کے پلاٹ عموماً سادہ ہوتے ہیں اور اُن میں صرف ایک واقعہ یا نفسیاتی پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن وہ افسانے جن کی بنیاد محض ایک نفسیاتی مطالعہ پر ہے ان کے بہترین کارنامے ہیں۔ "رفیق تنہائی" اور "بوڑھا اور بالا" اس قسم کے افسانوں میں بے حد نمایاں ہیں۔ اور اُردو میں ایسے افسانے بہت کم لکھے جاتے ہیں۔

میں شیخ رحمٰن کی بٹیا۔ بڑا ہونے لگی۔ رام کھلاون نے جہیز کا پلنگ
سر پر اگو چھا لپیٹ کر اٹھایا دولہا کا ڈولا گھر سے نکلا اور بانسری والے نے

بابل چھیڑ دیا۔"

اس مثال سے حسینی کی دو خصوصیتیں اور نمایاں ہوتی ہیں۔ سب سے
پہلے اُن کا شاعرانہ انداز بیان اور دوسری چیز جسے افسانہ کے فن سے
زیادہ لگاؤ ہے اُس کی ترتیب۔ حسینی کبھی کبھی افسانہ لکھتے وقت شاعرانہ
عالم میں آجاتے ہیں اور افسانے کے درمیان میں اُن کی شاعرانہ فطرت
کے چھوٹے چھوٹے مظاہرے بے حد دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے
ابتدائی افسانوں میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے۔ مثلاً اُن کا افسانہ "جذبۂ کامل"
رومان اور شاعری کا ایک حسین مرقع ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس میں
وہ نفسیاتی بلندی، وہ افسانوی دلکشی۔ وہ فنی سحر کاری موجود نہیں جو
رفیق تنہائی"، "بھوکی ہنسی"، "سکھی"، "بوڑھا اور بالا" میں ہے۔
حسینی کے افسانوں میں حُسن ایک خاص چیز ہے جس سے کبھی کبھی
اپنے افسانہ کے عالم کے اظہار کا بھی کام لیتے ہیں۔ افسانہ کا پلاٹ اور
اُس کی عموماً ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے
افسانوں میں مقامی رنگ سے بے حد کام لیا ہے۔ پریم چند کی طرح دیہاتی
زندگی کے مختلف پہلوؤں۔ دیہات کے رہنے والوں کی زندگی اہم مشکلات

ملک کے لوگوں کی ایک کمزوری کو عموماً کس بے دردی سے ظاہر کیا ہے۔
"پھر بھی بہو لڑکے اور پوتے ہی کے لئے پیاری ہوتی ہے۔ یہ دونوں
تو اچھے تھے، خوش تھے، کھیلتے کھاتے تھے۔ بہو کی صورت بگڑی بلا سے،
ان کا دکھ تو بسرا۔ اُس کی جان ہی پر کیوں نہ بن جائے"

افسانوں میں درد۔ اثر اور تڑپ پیدا کرنے کی کوشش میں عموماً
حسینی کا نظریۂ حیات حزنیہ ہو گیا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں تڑپ
پیدا کرنے کے لئے انسانی بے بسیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس طرح کرتے
ہیں کہ سُننے والے کو رونا آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بعض اس قسم کے
افسانوں کا انجام بے حد حزنیہ ہوتا ہے اور اس انجام کو طرح طرح سے حزنیہ
بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن عموماً وہ تضاد سے زیادہ کام لیتے ہیں۔
سفیدی کے سامنے سیاہی زیادہ چمکتی ہے۔ آنکھیں بجلی کی تڑپ اور
اُس چکاچوند کے بعد تاریکی کو اور زیادہ تاریک اور ڈراؤنا محسوس
کرتی ہیں۔ اس لئے خوشی اور ترنم کے تصور کے بعد غم اور درد کی تصویر
اور زیادہ بھیانک اور زیادہ ڈراونی اور اس سے کہیں زیادہ تاریک
اور موثر معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا افسانہ "سکھی" اس طرح ختم ہوتا ہے

"گنگا نامی نے اِدھر اپنی "بچھڑی ہوئی" بچیوں کو آغوش میں سمیٹ کر
زلفیں سنوارنا اور ریم کی حضوری کے قابل بنانا" شروع کیا اُدھر گاؤں

کہ وہ ان کمزوریوں کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا۔
اِن کے افسانوں میں "خواب و خیال" "بیگانہ" "شکست بے صدا" "دشمن کو دوش"
"تم میرے ہو" "دسن درچہ خیالیم فلک درچہ خیال"۔ بلند قسم کے افسانے ہیں۔

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کا سب سے بڑا راز اُن کا درد مند دل ہے۔ جیسا دل خود اُن کے پہلو میں ہے ویسا ہی دوسروں کے پہلو میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ فطرت انسانی کی دکھتی ہوئی رگوں کو پکڑتے ہیں۔ سخت دلوں کو درد مند بنانا چاہتے ہیں۔ درد مند دلوں میں درد سے بڑھ کر تڑپ اور تڑپ سے زیادہ اضطراب و بے چینی کے جذبات کی جلوہ فرمائی دیکھنے کے شائق ہیں۔ فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ اس لئے اُنھیں آڑ بنا کر ایسی ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ لوگ بے چین ہو جائیں۔ اُن کے دلوں میں یہ بے چینی اس حد تک بڑھے کہ وہ دوسروں کے درد میں کسک اور ٹیس محسوس کرنے لگیں۔ اس لئے وہ کبھی کبھی بجائے طنز یا ظرافت کے اپنے افسانوں میں حد درجہ کے استہزاد سے کام لیتے ہیں شلاً "بھو کی ہنسی" میں ہندوستان والوں کی خصوصاً اور دوسرے

پورا افسانہ اُس کی شرح، جس کی تکمیل انجام پر ہوتی ہے اور ٹریجڈی کا آخری حصہ جسے عموماً شروع میں نہیں بیان کیا جاتا، اس موقعہ پر آکر ختم ہوتا ہے۔ اس قسم کے افسانے اُن کے افسانوں کے دوسرے مجموعے 'سمن پوش' میں زیادہ ہیں۔

زندگی حزن و یاس کا مرقع ہے۔ اور مجنوںؔ کا خیال ہے کہ انسان زندگی میں جن روحانی تکالیف کا شکار رہتا ہے وہ موت کے بعد بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ممکن ہے کہ جسمانی تکلیفیں یہاں ختم ہو جائیں لیکن روحانی آلام و اضطرابات دوسری دُنیا میں بھی بالکل اُسی طرح قائم رہتے ہیں۔

مجنوںؔ اپنے افسانوں میں ادبی عنصر برابر شامل کرتے ہیں اور چونکہ ان کے کردار عموماً شاعر، فلسفی اور پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں اس لئے ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے اُس میں ادبیت اور شعریت ہوتی ہے۔ اِسی لئے مجنوںؔ کے مکالمے جہاں فلسفہ کی ٹھوس بحثوں سے خالی ہیں بے حد دلچسپ ہیں۔

مجنوںؔ کے افسانوں میں کردار نگاری کی کمزوریاں ہیں فلسفہ کی بے محل بحثیں ہیں، لیکن ان کے باوجود جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ افسانوی دلکشی ہے اور یہ دلکشی پڑھنے والے کو اس قدر مسحور کرتی ہے

افسانہ بے حد دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔ مجنوں افسانہ گوئی کے پورے فن سے واقف ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ افسانہ میں کس جگہ کیا چیز ضروری ہے۔ اور کس موقعہ پر وہ سب سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے ۔ اسی افسانوی دلکشی میں اضافہ کرنے کے لئے مجنوں نے اپنے سارے افسانوں کی ابتدا اپنے کسی کردار کی زبانی کروائی ہے، جو آپ بیتی کو نہایت موثر الفاظ میں بیان کرتا ہے اور سننے والے اُس میں ایک دلچسپ۔ فلسفیانہ اور نفسیاتی رنگ میں ڈوبی ہوئی کہانی کا لطف محسوس کرتے ہیں۔

مجنوں کا نظریۂ حیات حزینہ ہے اور حُزن ویاس اُن کے قریب قریب ہر افسانے پر چھایا ہوا ہے ۔ اُن کا ہر افسانہ ایک حُزن والم کی داستان ہے جس میں کسی نہ کسی شکستۂ محبت کی المناک کہانی دُہرائی گئی ہے ۔ اردو میں حُزینہ افسانے بہت ہیں اور سب میں ایک خاص انداز ہے لیکن مجنوں کا انداز ان سب سے الگ ہے ۔ وہ افسانے کی ابتدا بالکل شروع سے نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیں شروع سے واقعات کے درمیان میں لے آتے ہیں ۔ وہ قصّہ کو اسی جگہ سے شروع کرتے ہیں جہاں واقعات اپنے منتہا کو پہنچ چکے ہیں ۔ اس لئے ہم ٹریجڈی میں شروع ہی سے منہمک ہو جاتے ہیں اور اس حُزن کی بھری ہوئی داستان کی تفصیل میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں ۔ اُن کے افسانہ کی ابتدا واقعات کا منتہا ہے اور باقی

کا تعلق تلاش کرتی ہے اُس کے نزدیک دوسرے تعلقات بے بنیاد ہیں وہ ان سب کو آزادی سے توڑ سکتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کبھی پھر کہنے لگتے ہیں کہ محبت بلا ازدواج کے قائم رہ سکتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا نظریۂ محبت اخلاقی نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہیں خیال کیا جا سکتا ۔ لیکن رومانی دلکشی ، افسانوی لُطف اور فنی بلندی اِس قسم کے محبت کے افسانوں میں زیادہ پیدا ہو سکتی ہے ۔

اس قسم کے محبت کے جذبات دکھانے اور انھیں فطری بنانے کے لئے مجنوں نے اپنے کردار عموماً پڑھے لکھے رکھے ہیں ۔ ان میں سے شاید کوئی ایسا ہو جسے ادب اور فلسفہ سے دلچسپی نہ ہو ۔ ہر ایک شاعری اور فنون لطیفہ میں ماہر ہے ۔ اور اس لئے محبت کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے ۔ ہر چیز کو فلسفہ کی گہری نظروں سے دیکھتا ہے ۔

مجنوں کے افسانوں کا سب سے بڑا حسن اُن کی افسانوی دلکشی ہے وہ انھیں پلاٹ کے لحاظ سے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ دلچسپ بناتے ہیں اور پڑھنے والا ایک منٹ کو بھی ان میں دلچسپی کی کمی نہیں محسوس کرتا ۔ البتہ کہیں کہیں جب وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کا اظہار ، اپنے قائم کئے ہوئے نظریوں کا بیان ، اپنے کرداروں کی زبانی کروانے لگتے ہیں تو یہ چیز خشک سی معلوم ہونے لگتی ہے ۔ لیکن اگر اس مخصوص مکالمہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو

مجنوں گورکھپوری

مجنوں کے افسانے تخیّل کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے کسی قدر بلند ہیں۔ وہ خود فطرتاً کچھ فلسفی سے ہیں۔ اُس پر سونے میں سہاگا یہ کہ شوپنہار، گیٹے اور ہیگل کے فلسفہ نے اُن پر اپنا گہرا اثر جمالیا ہے اور اس لئے وہ ہر چیز کو بلند فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں مظاہرہ اُن کے افسانوں میں اُس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے جس سے اُنھوں نے برابر محبت کو دیکھا ہے۔ چونکہ اُن کے قریب قریب سب افسانے عموماً عشقیہ ہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک تھوڑے بہت اختلافات کے ساتھ ایک ہی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

وہ محبت کو ان قیدوں میں نہیں رکھنا چاہتے جن میں ہندوستان کے رسم و رواج نے اُسے جکڑ رکھا ہے۔ چونکہ اُن کا خیال ہے کہ "زندگی کا راز الفت ہے۔ اگر الفت نہ ہوتی تو آج کائنات میں کوئی نظام نہ ہوتا" "یہ ایک مقدّس حقیقت ہے جو زندگی کو بھی حقیقت بنائے ہوئے ہے"۔ "یہ زمانہ اور فطرت دونوں کی گرفت سے آزاد ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں کے ہیرو اور ہیروئن کی محبت میں نہ مذہب و ملت کو حائل کیا ہے نہ کسی رشتہ اور تعلق کو۔ محبت صرف عورت اور مرد

کانوں پر ایک بار معلوم ہوتی ہیں — "محاکمات فکریہ اور مناقشات وجدانیہ کو محکوم تعصب اور آرام سوز سمجھ کر اُن سے کلیتہً مجتنب ہے" "فجیعۂ حیات" - "ہماری تیرہ برس کی زندگی ایک فاجعۂ طولانی تھی" "وہ کونے جنھیں مکتوم رکھنا چاہیئے مکشوف ہو جائیں گے اور وہ شمنت جواب وہاں ہے نہ رہے گی" "اعماق مدہوشی" "ممتازیت عفیفانہ" اور اسی قسم کی اور بہت سی ترکیبیں سجاد حیدر کے افسانوں میں موجود ہیں - اور لطف یہ کہ وہ انھیں افسانوں میں ویسی زبان لکھنے پر بھی قادر ہیں "میرا نازک جسم سانولا سلونا تھا" "موہ لیں" "دان مانگوں" وغیرہ -

حقیقت تو یہ ہے کہ سجاد حیدر کے افسانوں میں اُن کی شگفتگی اور لطافت کے علاوہ فنی بلندیاں نہ شامل ہوتیں تو یہ زبان زیادہ کھٹکتی مگر اب اُن کے ہزاروں محاسن میں یہ چیز محض آفتاب کے داغ بن کر رہ جاتی ہے اور سجاد حیدر کو سوائے اس کے کہ سراہا جائے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا -

اِن کے افسانوں میں "آئینے کے سامنے" "گمنام خط" "کوسم سلطان" "عورت کا انتقام" زیادہ اچھے ہیں -

---

رومانیت غالب ہے اور اس میں بھی سجاد حیدر کی مخصوص فطرت نے اپنے لئے نئی نئی راہیں نکال لی ہیں۔ وہ عشق اور اُس کے جذبات کی تحریک کے لئے ہمیشہ رومانی پس منظر کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور عموماً یہ کام چاند اور اُس کی رومان پرور فضا سے لیا جاتا ہے۔ ان کے رومان کی روح رواں عورت ہے اور اس لئے وہ کبھی کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ بیوی سے بھی رومانی محبت کی جاسکتی ہے۔ اس سے بھی رومانی عشق کی لذتیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ہر عورت میں حُسن، رشک، اور رومان اس کے خمیر کے ساتھ داخل کیا گیا ہے، اس لئے ہر عورت سے محبت کی جاسکتی ہے اور وہ صرف محبت ہی کے لئے بنی ہے وہ صرف محبت کی دنیا میں رہ کر خوش رہ سکتی ہے۔

سجاد حیدر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے، ایک رومان پرست شاعر کی حیثیت سے، اور ان سب سے زیادہ ایک جذبات نگار مصور کی حیثیت سے، اپنے افسانوں میں حُسن اور دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ اُن کا طرز بیان انھیں برابر اُن کے ان بلند مقاصد میں کامیاب ہونے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں زبان میں ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ اسے خواہ دقت پسندی کہئے یا کچھ اور، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افسانوں میں جب اس قسم کی ترکیبیں بلا ضرورت آجاتی ہیں تو

یکسانیت اور ایک خاص طرح کا سکون پرور بہاؤ ہوتا ہے۔

نفسیات اور رومان کے علاوہ جذبات کی مصوّری میں سجّاد حیدر کو خاص ملکہ ہے۔ سدرشن جذبات کی شدید تصویر لفظوں میں پیش کرسکتے ہیں۔ لفظ ہمیشہ اُن کے پابند ہوکر چلتے ہیں اور اس لئے وہ جہاں چاہتے ہیں کسی جذبہ کو ایک جملہ میں، اُس کے شدید احساسات کی مصوّری کے ساتھ، بیان کردیتے ہیں۔ سجّاد حیدر کا طریقہ اس سے بالکل الگ ہے۔ وہ جذبات نگاری میں بھی ایک دو جملوں میں ساری تفصیلات کو بھرنا نہیں چاہتے بلکہ افسانے کے پورے پلاٹ، اُس کے واقعات کی رفتار اور اس کی ترتیب پر، جذبات کی مصوّری کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے افسانوں میں اتحاد اثر جتنا گہرا اور نمایاں ہے اتنا اور کسی افسانہ نگار کے یہاں نہیں۔ وہ افسانہ میں اتحاد اثر کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کے سارے افسانوں کی فنّی ترتیب بھی افسانہ کے تحریکی جذبہ یا اُس کے عالم اور روح سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ افسانہ میں عموماً ایک ہی واقعہ جذبہ یا نفسیاتی تحریک کے بیان کی بھی یہی وجہ ہے اور یہ چیزیں اُنھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتی ہیں۔

سجّاد حیدر کے افسانوں میں جو محبّت کا جذبہ پیش کیا گیا ہے اُس میں

مختصر نتائج اور تنقیدیں، نفسیاتی نکات پر مبنی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اُن کے پورے افسانے کی جان اُن کا پلاٹ ہے۔ سجاد حیدر نفسیات کو اپنے پورے افسانے پر طاری رکھتے ہیں وہ ایک منٹ کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اُن کا نفسیاتی نقطۂ نظر افسانہ کے ہر حصے میں یکساں نمایاں رہتا ہے اور افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی وہ اسی طرح قائم رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کا انداز بیان اور طرز افسانہ گوئی عموماً اُن کے افسانے کے عالم کا تابع رہتا ہے۔ افسانے میں جس قسم کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس سے جس طرح کے نتائج ہونے لازمی ہیں، اُن کا بہت گہرا اثر طرز بیان پر بھی قائم رہتا ہے۔

اُن کے افسانوں کی دوسری خصوصیت رومان ہے۔ اور اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ ہیں۔ نیاز کو اُردو کا سب سے بڑا رومانی افسانہ نگار کہا جاتا ہے لیکن سجاد حیدر کا جذبۂ رومان ایک امتیازی شان رکھتا ہے، اور اُنھیں نیاز سے بالکل الگ کر دیتا ہے۔ نیاز کے رومانی افسانوں میں ہمیشہ اضطراب اور ہیجان کو خاص دخل ہوتا ہے لیکن سجاد حیدر رومان اور سکون کو مرادف جانتے ہیں اور اس لئے ان کے افسانوں میں اس کی رفتار ایک گہرے اور بڑے دریا کی سی ہے، جس میں شوکت وحشم کے ساتھ برابر رفتار کی

نمونے ہیں۔ ان میں جذبات کی مکمل اور نفسیاتی مصوّری کی گئی ہے، اور
پڑھنے والا ان جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کا مجموعی
اثر پڑھنے کے بعد بھی ہمارے دلوں پر قائم رہتا ہے۔ اس قسم کے
نمونوں میں بلند، فطری اور نفسیاتی محاسن کے آئینے۔ "مرے آستانے والے"
"جہاں پھول کھلتے تھے"۔ "ایک مغنیہ سے التجا"۔ "میں چاہتا ہوں"۔
"کلو پیٹرا"۔ "قاہرہ کو دیکھ کر"۔ "تیرے بعد"۔ "ویران صنم خانے"۔ ہیں۔
ان سب میں افسانہ کی طرح ایک جذبہ کی ترجمانی شدید سے شدید لیکن
شاعرانہ انداز میں کی گئی ہے اور حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو
حقیقی جذبات میں ڈوبی ہوئی ایک نظم کہا جا سکتا ہے جس میں شاعر،
ردیف و قافیہ کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ایک آزاد فضا میں اپنے نغمے گا کر
سننے والوں کو دیوانہ بنا رہا ہے۔

سجاد حیدر کے افسانوں میں بھی نفسیات کو بے حد دخل ہے۔ پریم چند
کے افسانے نفسیات کی بلند سے بلند مصوّری کرتے ہیں، لیکن سجاد حیدر
اور پریم چند کے نفسیاتی نقطۂ نظر میں کافی فرق ہے۔ پریم چند اپنے افسانے
کے واقعات کے بیچ بیچ میں کوئی ایسا جملہ کہتے ہوئے چلتے ہیں جس کی بنیاد
حقیقت اور نفسیات پر ہوتی ہے، جس کا پڑھنے والے کے دل پر نفسیاتی اور
گہرا اثر ہونا لازمی ہے۔ اُن کی رائیں، واقعات کی تفصیلوں سے نکالے ہوئے

پہلے اُردو میں ترکی اور ایرانی افسانوں کے ترجمے کئے۔ ترکی افسانے اپنی رومانیت، شاعری اور ادب لطیف کی دلکشیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ سجاد حیدر نے یہ ترجمے کرکے ترکی افسانہ نگاری کی خوبیوں کو اُردو میں عام کر دیا۔ اور اس کا موجودہ دَور کے افسانہ نگاروں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اسی روش کا نتیجہ ہے کہ آج اُردو میں ہر زبان کے بہترین افسانوں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ فرانسیسی، روسی، انگریزی اور بنگالی ادب افسانہ نگاری کی حیثیت سے ہم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن ترجمے اس کثرت سے کئے گئے کہ ترجمہ کرنے والے خود اسی رنگ میں ڈوب گئے اور اُن کے طبع زاد افسانوں پر بھی وہی انداز چھا گیا جو اُن کے ترجموں پر تھا۔

سجاد حیدر کی افسانہ نگاری اور اُن کے ترجموں کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ وہ ترجمے نہیں معلوم ہوتے۔ اُنھیں اُردو کے قالب میں اس خوبصورتی سے ڈھالا گیا ہے کہ اُن پر ترجموں کا شبہہ تک نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سجاد حیدر کے ترجمے اور اُن کے طبع زاد افسانے پڑھتے وقت کوئی ایک دوسرے میں تمیز نہیں کر سکتا۔

اُردو میں جو چیز آج ادب لطیف کے نام سے مشہور ہے، اس کی حقیقی بنیاد سجاد حیدر کی ڈالی ہوئی ہے اور جس چیز کو سجاد حیدر خود 'احساسات' کے نام سے یاد کرتے ہیں، وہ اس قسم کے ادب کے بہترین

نیاز کے افسانوں کی ابتدائیں ہمیشہ بہت تصور زا ہوتی ہیں اور ہمیں فوراً اُسی دُنیا میں کھینچ کر لے جاتی ہیں جہاں افسانہ نگار خود ہے۔
نیاز کے دوسرے دور کے افسانوں میں حقیقت اور نفسیات کا مظاہرہ رومانیت اور کلاسیت سے کہیں زیادہ ہوا ہے جن میں ہمیں نفسیات کے گہرے نقوش اور تصورات کے علاوہ کرداری ارتقا۔ جذبات و تحریکات کی جنگ۔ خیالات و احساسات کے فطری نمونے زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان میں نیاز رومانیت پسند تو ضرور ہیں لیکن رومان پرست نہیں۔ اس کی کمی بڑی حد تک حقیقت شعاری نے پوری کی ہے۔
لیکن اس کے باوجود بھی ان کے رومانی۔ تخیلی۔ کلاسی۔ عاشقانہ نفسیاتی یا حقیقی ہر افسانہ میں پلاٹ کے لحاظ سے ہمیشہ دلچسپی ہے۔ افسانوی دلکشی میں کہیں کمی نہیں آتی۔

سجاد حیدر

اُردو افسانہ نگاری کو جن لوگوں نے بلند ادبی ترجموں سے مالامال کیا اُن میں سجاد حیدر کا نام سب سے آگے ہے۔ انھوں نے سب سے

عورت کے ساتھ ساتھ اُن کا نظریہ محبت بھی رومانی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ عورت محبت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ مرد اور اس کی محبت فطری ہے اور یہ انسان میں پرستش کی حد تک موجود ہونی چاہئے۔ محبت کا جذبہ اُن کے نزدیک فطری ہے۔ اِسے جتنا دبایا جائے گا اُتنا ہی اُبھرے گا۔ جتنا اسے چھپانے کی کوشش کی جائے گی اُتنا ہی نمایاں ہوگا۔ کوئی دل ایسا نہیں جو فطرت کی طرف سے محبت کے جذبات لے کر نہ آیا ہو۔ یہ جذبات غیر محسوس طریقہ پر ہمارے دلوں میں ترقی کرتے ہیں۔ فطرت اور اُس کے مظاہر، کائنات اور اُس کے تمام لوازمات کے کسی نہ کسی جزو میں محبت شامل ہے س لئے دل اِن چیزوں میں رومانی لذت اور محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں اور خود بخود محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نیازؔ کے افسانوں میں اسی وجہ سے اتحادِ اثر بہت زیادہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں اپنے جذبات اور احساسات کو نمایاں کرنے کے لئے خیالات کی رو میں جو جو جی میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ چیزیں جنھیں ہم ادب لطیف کہتے ہیں بے حد غیر دلچسپ ہو گئی ہیں اور اتحادِ اثر کے بجائے ہمارا جی اُکتانے لگتا ہے اور ان چیزوں کی شاعرانہ اور تخیلی دلکشیوں کا خیال دل میں نہیں رہتا۔

نقشِ ترنم بنا دیتی ہے۔ وہ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر
نشانِ موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔"
(چند دن بمبئی میں)

"عورت کائنات کی ساری حسین چیزوں کا نچوڑ ہے اور اس کے
بغیر زندگی بے کیف اور بے روح ہے۔"
(ایک معطّر فرشتہ)

عورت کا حُسن اُن کے نزدیک صرف دیکھنے کیلئے ہے۔ "آزاد۔
رمیدہ۔ آغوش سے دور"
(ایک رقاصہ سے)

یہ "ایک لذت ہے مجسم۔ ایک تسکین ہے متشکل۔ ایک سحر ہے مرئی۔
ایک نور ہے مادّی۔"
(عورت)

"لوگ کہتے ہیں کہ تو عریاں ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریاں مگر
وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ہوتی ہے۔" (رقاصہ)

یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ یہ کہتے ہیں "سب سے بڑا اعتراض
جو اس نوع کے لٹریچر پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اُس میں عورت اور اُس کے
متعلقات کا ذکر عنصر غالب ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عورت
اور اُس کے ذکر کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس کیا رہ جائے گا۔
کائنات میں کونسی دوسری چیز ایسی ہے جس سے آپ اس کی رونق کو قائم رکھ سکیں۔
وہ کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نثر میں شاعری کرنا چاہتے اس حسن کے ذکر
سے تائب ہو جائیں۔"
(مقدمہ کیوپڈ سائکی)

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نئی نئی باتیں نکالتی ہے۔ ہر جگہ نئے لطف پیدا کرتی ہے۔ اور ان کلاسی افسانوں میں رومان اور محبت کے کیف اور ہیجان پرور مرقعے کھینچتے جاتے ہیں۔ مثال کے لئے "زائر محبت"، "ثمر اکاگلاب" اور "کیوپڈ اور سائکی" کو دیکھئے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد ایک کلاسی اور تاریخی واقعہ پر ہے۔

ان کلاسی واقعات کے علاوہ کبھی کبھی وہ افسانے کا پلاٹ محض تخئیل سے پیدا کرتے ہیں اور ان میں رومانی عناصر شامل کرکے اُسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ اس تخئیل میں ہمیشہ افسانوی دلکشی اور رومانی فریب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

نیازؔ کے رومانی افسانوں کی جان، اُنھیں تاثیر سحر بنانے والی قوت، اُن میں شعریت اور رنگینی کی کیف آگینیاں شامل کرنے والی لطیف شے صرف عورت ہے۔ عورت کے نغمہ نے اِن کے ہر لفظ کو، ہر جملہ کو، ہر قصہ کو رومانی اور رومانی سے زیادہ کیف آور بنانے میں مدد دی ہے۔ عورت کو اُنھوں نے جن جن طریقوں سے یاد کیا ہے اُس کا ذکر کرتے وقت زبان نے جو کچھ کہا ہے اُس سے ان کی رومانیت کا صحیح اندازہ ہوجائے گا۔

"ایک حسین عورت کی جو حرکت ہے وہ ایک لطیف موسیقی ہے جس کا ساز نسائیت اور صرف نسائیت ہے وہ ہاتھ ہلاتی ہے گویا ہوا میں

اُنھیں محبت نہیں، بلکہ اُس کا جنون سا ہے۔ سجاد حیدر کے افسانہ بھی رومانی ہیں، اُن میں بھی رومانی کیف اور اُن کی رنگینیاں موجود ہیں، لیکن نیاز کی رومانیت اُن سے الگ ہے۔ وہ رومان کی آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ اِن کا رومان ہمیشہ اضطراب و ہیجان کا دمساز ہے۔ یہ اضطراب و ہیجان ہماری روح کو ہمارے احساسات کو، ہمارے جذبات کو عام سطح انسانی سے بلند لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے عالم کی سیر کرنے لگتے ہیں جہاں کا ہر ذرّہ رومان کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جہاں کی ہر نظر فریب رنگینی اور سادگی رومان کا پیام دے کر ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہمیں سرشار بنا کر اپنے گردوپیش سے اس قدر بے خبر کر دیتی ہے کہ ہم صرف رومان کی پرستش کو اپنے لئے پیام زندگی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نیاز کو اُردو کا سب سے بڑا رومانی افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

نیاز کے افسانوں میں رومانیت مختلف طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ اوّل تو وہ اپنے افسانے کا موضوع ایسے واقعات کو بناتے ہیں جو کلاسی حیثیت سے ایک رومانی درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کلاسی واقعات میں، کہیں معصومیت، کہیں سحر، کہیں رومانی طاقت کا مظاہرہ ہے کہیں خود ان کی فطری شعریت اور بلند شاعرانہ اور افسانوی تخئیل

اپنے ملکی تشبیہ اور استعاروں سے جان ڈالتے ہوئے چلتے ہیں -
اُنھوں نے اُردو میں ہندی طرز تحریر کی شیرینیاں شامل کردی ہیں -
ایک جگہ لکھتے ہیں " اُس کی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے " یہ چیز
خاص ہندی کی ہے لیکن اگر سلیقہ سے استعمال کی جائے تو ہم اُردو میں
اسے بے حد پسندیدہ خیال کرتے ہیں -

نیاز

نیاز کے افسانے پریم چند یا سدرشن کی طرح کسی مخصوص سوسائٹی
کے مرقعے نہیں ہیں - غالباً وہ مقامی رنگ یا کسی مقصد کا شامل کرنا
افسانہ کے لئے غیر شاعرانہ سا خیال کرتے ہیں جس سے افسانہ کی نزاکت
اور حسن کو ٹھیس لگتی ہے - اُن کے افسانے حسن اور عشق کی داستانوں
کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں - محبت اور عورت کا سب سے
زیادہ دلکش اور دل فریب موضوع ہو سکتا ہے - صرف اسی ذکر کے
بعد کائنات کے جسم مردہ میں روح اور کیف کی سرمستی پیدا کی جا سکتی
ہے - یہی چیز مردہ دلوں کے لئے پیام بیداری بن سکتی ہے - یہی وجہ
ہے کہ اُن کے افسانوں پر رومانیت چھائی ہوئی ہے - رومان سے

اُس کے پیچھے اندھے بن کر دوڑنے والے، کبھی حقیقی خوشی، سرمدی سرور اور روحانی سکون نہیں حاصل کر سکتے، اس لئے اپنے افسانوں میں برابر مختلف طریقوں سے دولت اور اُس کے حاصل کرنے والوں کو بے اطمینان اور جو لوگ اس سے بے نیاز ہیں اُنھیں خوش اور پر سکون زندگی بسر کرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ وہ دُنیا کو بُرا جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُسے سراسر حُزن و یاس کا مرقع نہیں سمجھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان دُنیا میں خوش رہنے کے لئے آیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو خوش رہ سکتا ہے۔ جو اپنی حالت پر قانع نہیں ہیں وہ خوش بھی ہرگز نہیں رہ سکتے۔

سدرشن شاعر اور رومان پسند ہیں لیکن شاعری اور رومان کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی عورت کی عظمت اُن کے دل میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اُسے ہمیشہ خاوند کا پرستار اور اُس پر جان دینے والی مخلوق جانتے ہیں۔ لیکن اُس کے باوجود بھی اُنھیں اُس کی کمزوریوں کا بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں کہ "عورت انتہا پسند ہے۔ اعتدال اُس کی فطرت کے خلاف ہے"

سدرشن کا طرزِ تحریر بے حد پیارا ہے۔ جذبات نگاری کے جذبے نے اُن کے بیان میں زور اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ وہ برابر اُس میں

جذبات یا تحریکات کی اس کشمکش کے دکھانے میں سدرشن کو فنی ملکہ ہے۔ "وزیرِ عدالت"، "ترک نمود" اور "مہر مادری" میں اس کی مصوّری نہایت کامیابی سے ہوئی ہے۔

سدرشن کی افسانہ نگاری اور اُس کے فن کا ایک حُسن یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو ہمیشہ آنے والے واقعات کے لئے تیار کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کی ضرورت نہیں ہوتی اور شاید فن کے نزدیک پڑھنے والوں کو کسی آنے والے استعجاب کی خبر نہ دینا زیادہ بہتر ہے لیکن وہ عموماً یہ کرنا پسند نہیں کرتے اور کبھی تو پلاٹ کی ترتیب سے اور کبھی خود اپنے جملوں سے یا اپنی رائے سے پڑھنے والے کو یہ بتا دیتے ہیں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

سدرشن کی تنقیدِ حیات بھی دوسرے افسانہ نگاروں سے کسی قدر مختلف ہے۔ وہ دُنیا کو 'غرض پرست، بے وفا اور سفلی دُنیا کہہ کر پکارتے ہیں جہاں انسان حرص و ہوا کے پُر زور تھپیڑوں سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُن کے نزدیک اس کا تریاق صرف حُسنِ اخلاق ہے اور اس لئے وہ اسی کے عمل پر زور دیتے ہیں۔ سدرشن کی تنقیدِ حیات کا دوسرا پہلو دولت اور ثروت و جاہ سے نفرت اور غریبی اور قناعت سے محبت ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دولت اور ثروت پر مٹنے والے،

کی زندگی کے انقلابات دکھائے ہیں۔ اُنھوں نے ہر موقع پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی اصل فطرت ماحول کی وجہ سے رفتہ رفتہ بدل جاتی ہے اور آخر میں آکر ایک مستقل شکل اختیار کرلیتی ہے لیکن کچھ واقعات زندگی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان اپنی اس فطرت کو بھی بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو مدتوں کی تشکیل کے بعد ایک مستقل صورت اختیار کرچکی ہے۔ سدرشن کی افسانہ نگاری کا ایک مخصوص پہلو یہ بھی ہے، حتیٰ کہ اُن افسانوں میں بھی جہاں اُنھوں نے کوئی مثالی کردار پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس نفسیاتی پہلو کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور جن افسانوں میں مثالی کردار نہیں پیش کئے وہاں کمزوریوں اور محاسن کو برابر نمایاں کرتے گئے ہیں۔ ہر جگہ یہ دکھایا ہے کہ کس طرح انسان واقعات اور ماحول سے متاثر ہوکر بُری باتیں اختیار کرلیتا ہے اور پھر کس طرح دوسرے واقعات اُسے خوبیوں کی طرف مائل کردیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر انھیں عموماً انسانی جذبات کی کشمکش دکھانی پڑتی ہے۔ افسانہ میں کردار نگاری کے موقع پر افسانہ لکھنے والے کو ایسے موقع پیش آجاتے ہیں جہاں اُس کا افسانوی کردار دو سخت جذبات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ آسانی سے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کونسی چیز کو لے اور کسے چھوڑ دے

افسانہ کے پلاٹ کا انتخاب عموماً وہ سوسائٹی کے اوسط درجہ کے
طبقہ کے لوگوں کے واقعات سے کرتے ہیں۔ ان واقعات میں سے
اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں جن سے ہم خود بھی واقف ہیں اور جنھیں ہم
اچھی طرح جاننے کے باوجود بھی دلچسپی سے بیان نہیں کر سکتے۔
اُن کے پلاٹ عموماً شہر کے رہنے والوں کی، پڑھے لکھے ملازم پیشہ
لوگوں کی، معمولی حیثیت کے تاجروں کی زندگی کے مرقعے ہوتے
ہیں اور اس لئے اُن پر مقامی رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔
ایسے افسانوں میں "شاعر"۔ "اپنی طرف دیکھ کر"۔ "خانہ داری کا سبق"
"ترک نمود"۔ "صدائے جگر خراش"۔ "تبدیل قسمت"۔ "دو دوست"
اور "فریب دولت" اس حیثیت سے کامیاب افسانے ہیں کہ اُن میں
افسانہ نگار نے برابر افسانوی وفا شعاری کا ثبوت دیا ہے اور اُسی
زندگی کی مصوری کی ہے جس سے وہ خود اچھی طرح واقف ہیں۔
ہماری زندگی کے معمولی واقعات، فضول خرچی، شادی بیاہ، ملازمین،
بیماریاں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں کبھی کبھی ہمارے لئے بہت اہم
اور دقت طلب مسائل بن جاتے ہیں۔ اگر ہم اس کا اندازہ کریں
تو کبھی کبھی یہی باتیں ہماری زندگی کو بالکل تبدیل کر دیتی ہیں۔
سدرشن نے اس قسم کے واقعات سے ہمیشہ اپنے افسانوی کردارو ں

"کنول کی بیٹی" پر نمایاں ہے۔

تیسری چیز جس نے سدرشن کو ایک کامیاب افسانہ نگار بنانے میں مدد دی ہے۔ وہ اُن کے خیالات اور بیان کا نفسیاتی پہلو ہے۔ سدرشن نے نفسیات انسانی کی مصوری کو اپنے افسانوں میں کافی دخل دیا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں کیا کہ پورے افسانے کی بنیاد کسی نفسیاتی نقطہ پر رکھتے۔ بلکہ اس کے بجائے وہ یہ کرتے ہیں کہ افسانہ بیان کرتے کرتے واقعات کے درمیان میں ایک تیسرے شخص کی حیثیت سے واقعات پر کوئی نفسیاتی تنقید کر دیتے ہیں۔ واقعات کے ساتھ صرف ایک نفسیاتی پہلو کی جھلک دکھا کر پھر اپنے بیان کو اسی انداز پر لے آتے ہیں جیسا اس سے پہلے تھا۔ مثلاً اپنے افسانے 'شاعر' میں ایک جگہ لکھتے ہیں "شاعر کا جسم شب بیداری سے چور چور ہو رہا تھا۔ لیکن اظہار کمال کے اشتیاق نے تھکے ہوئے پیروں کو پَر لگا دئے تھے۔"

سدرشن خواہ افسانہ نگاری کے آرٹ پر عبور نہ رکھتے ہوں، خواہ اُنھیں اس کے فن کی نزاکتوں کا احساس خود نہ ہو لیکن اُن کے بعض افسانوں کے تمام اجزا میں فنّی محاسن موجود ہیں۔

دو ایک ایسے جملے ملاحظہ کیجئے تاکہ اس کا صحیح اندازہ ہو جائے "جس کا دل کڑھ رہا ہو، جس کی آنکھیں اشک باری کر رہی ہوں جس کا دماغ پریشان ہو اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ایسی خوفناک معلوم ہوتی ہے جیسی شمسان میں چاندنی۔"

"شِشوپال نے آگ میں پڑے ہوئے پتے کی طرح گرم ہوکر جواب دیا"
"اُس کی آنکھیں اس طرح کھلی ہوئی تھیں گویا روح کی تمام تر قوتیں آنکھوں میں جمع ہو کر کسی بات کا انتظار کر رہی ہیں۔" "انسانی دل ایک اتھاہ ساگر ہے جہاں کنول کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خونیں جونکیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔" "ایمان مجھے ہوا سے ہلکا اور پانی سے پتلا معلوم ہونے لگا۔"

اِن مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سدرشن جذبات کو لفظوں میں بیان کرنے پر کتنے قادر ہیں۔ اسی کا نام شاعرانہ فطرت ہے۔ سدرشن کی اس فطرت کا اثر کبھی اُن کے اسٹائل پر پڑا اور کبھی محض واقعات کے انتخاب پر۔ کبھی اُن کے اسٹائل میں اُن کا شاعرانہ انداز اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے "لیکن کیا خبر تھی کہ یہ مسرت غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی سُرخی ہے۔" موضوع اور پلاٹ کے انتخاب میں اس فطرت کی جھلک اُن کے افسانوں میں سے "شاعر" اور

سدرشن

سدرشن کے متعلق اگر ایک جملہ میں کوئی تنقید کی جا سکتی ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اُردو کے سب سے بڑے جذبات نگار افسانہ نویس ہیں۔ شاعروں کے متعلق ہر شخص یہ کہتا ہے کہ اُن کا سب سے پہلا مقصد جذبات نگاری ہے۔ وہ جذبات کو جس قدر فطری طریقہ سے، جتنا زیادہ موثر بنا کر اور جتنے کم سے کم لفظوں میں بیان کردیں گے اُتنے ہی بڑے آرٹسٹ سمجھے جانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے شاعر کے لئے جہاں جذبات انسانی کی گہرائیوں پر عبور ہونا ضروری ہے وہاں دوسری طرف اُس کے اظہار کے لئے ویسے ہی لفظوں کی تلاش اُس سے کہیں زیادہ ضروری ہے ورنہ اپنے محسوسات دوسروں تک نہیں پہنچ سکتے۔ افسانہ نگاری کے متعلق بارہا کہا گیا ہے کہ وہ بھی شاعری کی طرح ایک لطیف فن ہے۔ اس خیال کی عملی تکمیل ہمارے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ سدرشن کے یہاں ہوئی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے انسانی جذبات کی انتہائی گہرائیوں کی مصوّری بے حد کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ مثال کے لئے اُن کے افسانوں میں سے

یہ الزام اُن کے لئے نظرِ بد سے بچانے کا ایک ٹیکا ہے۔ پریم چند کے بیان میں ایک خاص چیز جو برابر اُن کے ہر افسانہ پر چھائی ہوتی ہے اُن کی شگفتگی ہے۔ طرزِ بیان شگفتہ ہونے کے علاوہ اُس میں جابجا مزاح کے نازک اور چھوٹے ٹکڑے خوبصورت نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے معلوم ہوتے ہیں۔ صرف ایک آدھ مثال سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

"بعض بلند پرواز حضرات اس امر کے بھی شاہد تھے کہ اُنھوں نے اکھے بابو کو جگنو کی روشنی میں پڑھتے دیکھا ہے۔" (عالم بے کس)

"اکثر وعاؤں میں ایسے شاعرانہ تلازمے، ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سُن کر حیرت ہوتی تھی" (آہ بے کس)

پریم چند اور اُن کے افسانوں کی تعریف مبالغہ نہ معلوم ہو تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے "پریم چند کے افسانے ہندوستان کی سرزمین کے بہترین افسانے ہیں۔

ملکہ ہے۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند ہماری زبان میں افسانہ گو کی حیثیت سے سب سے نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ اُن میں ہر معمولی سے معمولی چیز کو دلچسپ اور دلکش بنا دینے کی قدرت ہے۔ وہ ہماری زندگی کے معمولی سے معمولی واقعات کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اُن میں ہر جگہ حیرت خیز کشش و پیچ، شاعرانہ رنگینیاں، نفسیاتی بلندیاں اور افسانوی دلکشیاں محسوس کرتے ہیں۔ اور افسانہ نگار کے لئے یہی صفت ایسی ہے جو اُس کی ہر کمزوری کو چھپا سکتی ہے۔

دوسری چیز اُن کا اسٹائل یا طرز بیان ہے۔ وہ ہر چیز کو نہایت آسان، مزے دار اور پُر لطف زبان میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جہاں ایک طرف افسانہ کا لطف لیتا جائے وہاں دوسری طرف بیان کا لُطف بھی اُس کی دلچسپیوں میں اضافہ کرتا رہے۔ ہندی اور فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج، تشبیہوں اور استعاروں کی عمومیت اور نفسیاتی عالمگیریت، الفاظ کا برمحل استعمال، یہ چیزیں پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ہندی اور فارسی کے لفظ اس انمل، بے جوڑ طریقہ سے لکھے گئے ہیں کہ روانی میں فرق آجاتا ہے لیکن شاید پریم چند پر

کیا ہونے والا ہے۔

تفصیلات افسانے کے لئے بُری سمجھی جاتی ہیں۔ اُن کی جگہ تصور آفرینی سے مدد لی جاتی ہے لیکن پریم چند کے افسانوں کا خاص حُسن اُن کی تفصیلات میں ہے اور یہ تفصیلات ادب کی تصوّر آفرینی کی کمی کو بہت اچھی طرح پورا کرتی ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں لوگ رومان کی کمی محسوس کرتے ہیں لیکن اُن کے افسانوں میں جابجا رومان کی جھلک بھی بے حد دلکش معلوم ہوتی ہے، اُن کی رومانیت نیازؔ یا سجادؔ حیدر کی سی نہیں لیکن اس کے باوجود بھی اس میں حقیقت اور اصلاحی مقصد کے امتزاج نے ایک نئی بات پیدا کر دی ہے۔ ہم رومان میں حقیقت، نفسیات اور سچائی کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ زندگی کے سچے اور حقیقی واقعات میں رومان کا لطف آتا ہے۔ اُن کے ایسے افسانوں میں "تریا چرتر" "اُمرت" "مناون" اور "وفا کا جال" خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں فن کی حیثیت سے جو باتیں بھی ہوں لیکن جو چیزیں اُن کے ہر افسانے کو سحر بنا دیتی ہیں اُن کا تعلق براہِ راست اُن کی ذات سے ہے۔ پہلی چیز یہ کہ اُن میں افسانہ گوئی کا فطری

چیزوں میں انتخاب کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ دو محبوب چیزوں میں سے ایک کو پسند کرلیتا ہے اور اُسی پر عمل کرتا ہے لیکن اس کی کوئی نہ کوئی خاص اور معقول وجہ ضرور ہوتی ہے۔ کرداروں کا اضطراب میں ہونا افسانہ نگاری کا ایک حُسن خیال کیا جاتا ہے۔

پریم چند اپنے افسانوی کرداروں کو عموماً اپنے افسانے کے شروع میں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اُن کی خصوصیات ہم سے بتا دیتے ہیں اور ان خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لئے، انھیں حقیقت کا لباس پہنانے کے لئے خود کردار کی زندگی کے ایسے واقعات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے اس خصوصیت کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ "بڑے گھر کی بیٹی"، "گناہ کا اگن کنڈ" اور "نمک کا داروغہ" اُن کی کردار نگاری کے اچھے نمونے ہیں۔

پریم چند کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جن میں اُن کی ترتیب اور عالم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں مناظر سے، کہیں لباس سے، اور کہیں کسی بیانی تفصیل سے، پڑھنے والے کو آنے والے واقعات کے سُننے اور دیکھنے کے لئے تیار کیا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اُس سے اُسے خود بخود اندازہ ہونے لگتا ہے کہ آئندہ

لیکن اس کے علاوہ کردار نگاری، ترتیب، پلاٹ، نقطۂ نظر اور اسٹائل کے لحاظ سے بھی پریم چند میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہر پڑھنے والا نمایاں طور پر محسوس کرتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں کے کردار زیادہ تر مثالی ہوتے ہیں، جن کے اعمال کو دیکھ کر ہم انھیں اپنے لئے بہترین نمونہ بنا سکتے ہیں اور اُن کی فطرت سے سبق لے کر اپنے آپ میں ایک خاص حسن پیدا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے کرداروں میں برانی سارندھا بے حد نمایاں ہے۔

لیکن اس موقعہ پر اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خواہ اُن کے افسانوں کے کردار مثالی ہوں خواہ حقیقی، اُن میں سے ہر ایک کے لئے کرداری ارتقا کا ہونا ضروری ہے۔ کوئی کردار جو فعل آخر میں جا کر کرتا ہے اُس کے لئے وہ رفتہ رفتہ اُس کی وجہیں پیدا کرتے جاتے ہیں اور آخر میں یہ سب وجہیں مل کر اُس کے فعل کو اُس حد تک پہنچا دیتی ہیں جس پر افسانہ کی بنیاد ہے۔

اس کے علاوہ اپنے کرداروں میں سے قریب قریب ہر ایک کو کرداری ارتقا کا بہترین نمونہ بنانے کے علاوہ انھیں ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جب اُسے دو مختلف

کی یاد سے چھپت راسے کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔"

اس حیثیت سے پریم چند کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اُردو افسانوں میں حقیقت شعاری کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہر جگہ عالمگیر حقائق، عام فطرت انسانی، نفسیات اور بلندی خیال کو مدنظر رکھا ہے۔

لیکن ایک جگہ پریم چند حقیقت پسندی سے کسی قدر الگ ہٹ گئے ہیں۔ اُن کے افسانوں کے انجام عموماً طربیہ ہیں۔ وہ ہمیشہ اچھے عمل کا اچھا نتیجہ دکھانا چاہتے ہیں حالانکہ زندگی میں واقعات ہمیشہ اس کے منافی ہوتے ہیں۔ پریم چند نے صرف اصلاحی مقصد کو نمایاں کرنے کے لئے ایسا کیا ہے لیکن اکثر جگہ واقعات کی رفتار اس قسم کی ہے جس سے ہم خود بھی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں جس پر پریم چند پہنچے۔ اُن کا انجام ہمارے نزدیک بھی وہی ہو سکتا ہے جو ہوا۔ البتہ کہیں کہیں اس جذبہ کی وجہ سے نتیجہ کسی قدر غیر فطری ہو گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے کوشش کر کے اسے طربیہ بنایا ہے۔

پریم چند کے افسانوں کے متعلق یہ تو ایک مجموعی رائے ہوئی اور حقیقت میں یہی چیزیں اُن کی امتیازی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں

پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اگر ہم کسی انسان کا کوئی ایسا عمل دیکھیں جو اخلاق عالمگیری یا حقیقت انسانی کی حیثیت رکھتا ہو تو اسے افسانہ کی ایک بڑی خوبی سمجھنا چاہئے۔ یہ چیز پریم چند کے اکثر افسانوں میں ہے۔

دوسری چیز جو اس سے بالکل ملتی جلتی ہے وہ فطرت انسانی ہے جو ہر ملک اور ہر ملک کے لوگوں میں یکساں ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں ہم نفسیات کہہ سکتے ہیں۔ انسان ایک ہی قسم کے واقعات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے؟ اس کے تعجب، حیرت، رنج، خوشی، غصّہ، نفرت، حسد، بغض، رشک، رقابت اور اس قسم کے فطری جذبات کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیزیں سب انسانوں کے لئے یکساں ہیں۔ اور اس لئے افسانوی بلندی حاصل کرنے کے لئے افسانہ نگار نفسیات سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانے نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدہ سے بھرے پڑے ہیں۔ اس چیز سے پریم چند نے اس قدر کام لیا ہے کہ اپنے اسٹائل میں، اپنے طرز بیان میں، اور اپنے جملوں میں جہاں تشبیہات دیتے ہیں تو انھیں نفسیاتی محسوسات کو کام میں لاتے ہیں ایک جگہ لکھا ہے۔

"جیسے یتیم بچّہ ماں کا تذکرہ سُن کر رونے لگتا ہے اسی طرح اور چھا

پلاٹ کے آیندہ واقعات کے لئے ایک دلکش پس منظر بناتے ہیں۔
مقامی اثر کے افسانوں پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک محدود طبقہ کے لئے دلچسپی کا سامان بن سکتے ہیں۔ اُن سے صرف وہی لوگ لطف اُٹھا سکتے ہیں جو اس زندگی سے تھوڑی بہت مناسبت یا تعلق رکھتے ہیں۔ دوسروں کو اس میں کوئی لطف نہیں آسکتا۔ اوّل تو اس خیال کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اور اگر بالفرض اس بات کو مان بھی لیا جائے تو پریم چند کے افسانوں پر اس کا اطلاق ہرگز نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاں پریم چند نے دیہاتی زندگی کے واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہم وہاں کی دلچسپیوں اور وہاں کے رہنے والوں کی تکلیفوں کا اندازہ کر سکیں وہاں دوسری طرف انھوں نے ان افسانوں میں عالمگیر حقایق کو مد نظر رکھ کر ایسی باتیں بھی بیان کی ہیں جو عام فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔ ان واقعات کو محض ایک بلند حقیقت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان سے صرف افسانوی پس منظر کا کام لیا ہے اور اس کے بعد ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کا اطلاق ہر انسان پر، ہر ملک اور ہر قوم کے باشندوں پر، ہو سکتا ہے۔ بلند جذبات ہر ملک اور ہر قوم میں سراہے جاتے ہیں۔ اچھے خیالات ہر مذہب اور ہر قوم اور ہر ملک نے

جلاتا ہے لیکن یہ بابِ رحمت کبھی اس طرح کھلتا ہے کہ پھر بند ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اور غریب کسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اس کی رہی سہی امیدیں اس سیلاب کے ساتھ بہ جاتی ہیں۔ امیدوں کا سہارا لوٹ جاتا ہے۔ لیکن صبر اور شکر سے کام لیتا ہے۔ اس کی سزا اُسے اس طرح بھگتنی پڑتی ہے کہ جاڑے میں پالا، سب ہرے ہرے پودوں کو، اُس کی مہینوں کی محنت کو، اُس کی زندگی کے آخری سہارے کو جلا دیتا ہے، اُس کی آزمائش اس طرح بھی نہیں ختم ہوتی تو کوئی اور نیا شگوفہ کھلایا جاتا ہے۔

غرض اُس کی زندگی ایک عبرت کا مرقع ہے اور دُنیا میں زندہ جہنم کا نمونہ۔ اس کا اندازہ ہر شخص کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کوئی اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتا اس لئے پریم چند لوگوں کے سامنے ان کی سچی سچی داستانوں کے درد بھرے فسانے سیدھے سادے لفظوں میں ہمارے آگے رکھ دیتے ہیں۔

پریم چند دیہاتی زندگی کے تشائم پہلو کو نمایاں کرنے سے پہلے ہمارے دلوں میں وہاں کی زندگی کے پُر لطف خیالات پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے افسانوں کی ترتیب میں وہاں کی زندگی کے نظر فریب مناظر پیش کر کے ہمارے جذبات کو سکون دیتے ہیں اور ان مناظر کو

پلاٹ کے لئے واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن ان میں سے جو
چیز ان کے افسانوں میں بے حد نمایاں ہے وہ دیہاتی زندگی ہے،
دیہاتی زندگی کے واقعات پریم چند نے اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں
کہ اگر کوئی شخص یہاں کی دیہاتی زندگی سے واقف نہ ہو تو اُسے
بہت اچھی طرح اس کا علم ہو جائے۔ دیہاتی کن کن روحانی
تکلیفوں کے شکار رہتے ہیں؟ کس طرح زمیندار، مہاجن، پولیس،
پٹواری اور تحصیل والے اُن کی زندگیوں میں روز نئے نئے
شگوفے کھلاتے ہیں؟ اُن پر کن کن نئے طریقوں سے ستم
توڑا جاتا ہے؟ کیسے وہ ان تکلیفوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت
کرتے ہیں؟ اور صرف خدا کو اپنا سمجھ کر اُن کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں
اور اس کے بعد فطرت بھی ان غریبوں کو اپنی پناہ میں نہیں
لیتی۔ اُس کا سارا غضب و غصّہ، اُس کی ساری خفگی، اُس کے
سارے جہاں سوز کرشمے صرف دیہاتی کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔
کبھی بجلی کی آتش سامانیاں اُن کے خرمنوں کو جلا کر اُن کی روزی
کا سہارا چھین لیتی ہیں۔ کبھی اس آگ کو بجھانے کے لئے فطرت
فیاضی سے کام لیتی ہے۔ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آتے ہیں۔ بارش کا
پہلا قطرہ اس کے دل کے سکون اور قلب کی راحت کا سامان

پریم چند کے بہت سے افسانوں کے پلاٹ راجپوتوں کی زندگی سے متعلق ہیں۔ کہیں کسی راجپوت عورت کی بہادری، ایثار اور قربانی دکھائی گئی ہے، کہیں وطن پرستی، محبّت اور احسان کے دلفریب مرقعے پیش کئے گئے ہیں، کہیں آن اور عزّت کے احترام کے لئے جاں بازی کا سبق سکھانے کے لئے کسی راجپوت کا سچا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ پریم چند کے اس قسم کے افسانوں میں 'وکرماد' 'رانی سارندھا' راجہ ہردول، گناہ کا اگن کنڈ، خاص طور پر بہت اچھے افسانے ہیں، جن میں کسی نہ کسی راجپوت روایت کو افسانہ کے پلاٹ کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ان میں راجپوتوں کی مخصوص فطرت دکھائی گئی ہے۔ ایسے افسانوں میں جا بجا پریم چند نے شعریت سے کام لیا ہے۔ کہیں کہیں واقعات میں روحانی انداز پیدا کر دیا ہے۔ حقیقت شعاری، ان میں دوسری قسم کے افسانوں کے مقابلہ میں کم ہے۔ لیکن اتنی کم نہیں کہ واقعہ غیر فطری معلوم ہو۔

پریم چند کے افسانوں کی دوسری اہم خصوصیت اُن کا مقامی رنگ ہے۔ اُنھوں نے اپنے زیادہ افسانوں میں ہندوستان کی مخصوص باتوں کا ذکر کیا ہے۔ کہیں راجپوتوں کی زندگی، کہیں دیہات کی زندگی، اور کہیں ہندو گھرانوں کی زندگی سے اپنے

نہ سکیں گی۔ ہمارا زمانہ اِن دو منزلوں کے بیچ میں ہے جہاں سے ہم مادّہ پرستی کے ظاہری لیکن فنا ہونے والے پُر فریب کھیلوں کو بھی دیکھ رہے ہیں اور جہاں سے پیچھے مڑ کر ہمیں روحانی صفات اور بلند کرداروں کی بزمیں بھی سجی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہر شخص اِسے محسوس نہیں کر سکتا۔ ہر شخص پُرانی چیزوں کی بلندی کا احساس نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کے دل میں اُن کی پر عظمت یاد سے تڑپ اور بیچینی نہیں پیدا ہوتی۔ لوگ آنے والے زمانہ کے شیدائی ہیں۔ دنیا نظر کو فریب دینے والی زینتوں پر جان دیتی ہے۔ روح، دل، ابدی سرور اور حیات جاوداں کا نام افسانہ کہن بن چکا ہے۔
پریم چند کو اس کا شدید احساس ہے۔ وہ ہندوستان کی عظمتوں کو صرف افسانہ سمجھ کر بھلا دینا نہیں چاہتے۔ وہ راجپوتوں کی روحانی قوتوں، اُن کی بہادری، جاں بازی اور وطن پرستی کے جذبات کا سچے دل سے احترام کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی قوم کے دل میں اس احساس سے ایک نئی چمک پیدا کر دیں۔ اُن کے افسانوں کو صرف کہانی نہیں بلکہ عبرت خیز اور حیات افزا داستانیں سمجھ کر دُہرایا جائے۔ لوگ سُنیں اور اپنے بُھولے ہوئے قصہ ماضی کو حیات کا پیغام سمجھ کر اُس پر عمل کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ

پریم چند

پریم چند اُردو افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے افسانوں میں قریب قریب وہ ساری باتیں موجود ہیں جو مختلف حیثیتوں سے افسانہ کو بلند بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود اُن کی فطرت افسانہ نگاری کے لئے سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کو ایک نہیں بیسوں طریقوں سے دلچسپ اور دلکش بنایا ہے اور ہر مذاق کا آدمی اُنھیں پسند کرنے پر مجبور ہے۔

پریم چند کے افسانوں کی پہلی خصوصیت اُن کا جذبۂ قومی ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی ہر اُس چیز کو پرستارانہ نظروں سے دیکھتے ہیں جو اُسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے۔ اُن کے دل میں ہر اُس چیز کی قدر ہے جو انسان کو فرشتوں کا ہمسر بناتی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں ہر اُس خیال سے خوشی، عظمت اور احترام کی جھلک پیدا ہوتی ہے جس میں روحانی بلندی شامل ہے۔ ہماری تہذیب جتنی ترقی کرتی جائے گی ہم مادیت سے قریب ہوتے جائیں گے اور روحانیت سے دُور۔ یہاں تک کہ ہماری نظریں اسے دیکھ بھی

ہمارے افسانہ نگار

کے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے زیادہ سے زیادہ افسانے پڑھیں۔ انھیں پڑھ کر ہی ان کے نازک احساسات میں بیداری پیدا ہو سکتی ہے اور اُس کے بعد صرف اس چیز کو افسانے میں شامل کر کے، وہ اپنی فطری صلاحیت کی مدد سے ایسے افسانے لکھ سکتے ہیں جنھیں لے کر وہ افسانوں کی اچھی سے اچھی نمائش میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان میں کوئی چیخوف، ترگنیف، گورکی اور موپساں نہ پیدا ہو سکے۔

مختصر یہ کہ ہماری افسانہ نگاری ہماری نظروں کے سامنے ایک دلکش اور دلفریب مستقبل کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ ہمارے افسانہ نگار چاہیں تو ان اُمیدوں کو بار آور کر سکتے ہیں۔
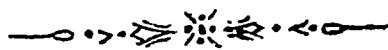
لیکن دوسری چیز جو اس سے کہیں زیادہ اہم ہے، ان چیزوں کی ترقی نہیں بلکہ فن افسانہ نگاری کی انتہائی تکمیل ہے۔ ہمارے اچھے افسانہ نگار بلند سے بلند قسم کے افسانے لکھتے ہیں، انھیں پڑھ کر ہم تڑپ جاتے ہیں، اُن کے پرستار بننے پر مجبور ہیں، اُن سے ہمیں عقیدت ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعد جب ہم موپساں، چیخوف، ترجینف، گورکی۔ لارنس یا جوائس کا کوئی افسانہ پڑھتے ہیں تو ہم پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ باتیں وہی ہیں جو ہمارے افسانہ نگار بیان کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ہمارے افسانہ نگار اس حیثیت سے اُن کے آگے نکل جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی جو چیز ہمیں اُن کے آگے سرِ عقیدت جھکانے پر مجبور کرتی ہے، وہی فن اور اس کا انتہائی کمال ہے۔ فن کوئی اکتسابی چیز نہیں اُس کا تجزیہ ہم مختلف موضوعہ اصول کی بنا پر کرتے ہیں۔ یہ اصول بڑی حد تک چیزوں کو ایسی حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ ہر دوسری چیز سے بلند معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان سب کے پردے میں ایک روحانی لذت، ایک سحر آفریں جذبہ اور ایک جمالیاتی حس اپنا کام کرتا رہتا ہے اور یہی فن اور اُس کے اصول کی آخری لڑی ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے وہ یہ کہ فرانس، روس، امریکا اور انگلستان

اچھے افسانوں کو پڑھنے والوں کے سامنے لائیں۔ یہ صحیح معنوں میں ادب کی حقیقی خدمت ہوگی۔ اس قسم کی سرگرم خدمات ہمارے رسالوں میں "ساقی" "ادبی دُنیا" اور "ہمایوں" انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے رسالے بھی اگر ان کے معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے تو اپنے آپ کو افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری خدمات کے لئے مخصوص کر لیں۔ معارف، اُردو اور جامعہ سے سبق لیں۔

بہرحال یہ ہماری مخلصانہ رائے ہے اور صرف اس لئے کہ ہم اپنے آپ کو ترقی کی بلند سے بلند منزلوں پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ بُرے افسانوں کے متعلق تو یہ، اب رہے اچھے افسانہ نگار اور اُن کے اچھے افسانے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اُن میں افسانوی دلکشی، صداقت، حقیقت اور نفسیات، ہر چیز نے اتنی قابل قدر ترقی کر لی ہے تو اب آئندہ ترقی کی کیا گنجایش رہی؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ان چیزوں نے، اس میں شک نہیں کہ اُردو میں حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن ترقی کی راہیں بند تو نہیں ہیں اُن کی کوئی حد تو مقرر نہیں ہے۔ ان چیزوں میں جتنی ترقی ہوئی ہے اُس سے زیادہ ابھی اور ہونی ممکن ہے اور ہمیں یقین ہے کہ موجودہ رفتار سے یہ منزل بھی بہت جلد آجائے گی۔

احساس تک نہ رہے اور وہ کسی ایسے غار میں جا پڑیں جہاں اُن کا انجام ظلمت کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ روش ہماری افسانہ نگاری میں پیدا ہو چلی ہے اور جہاں ہر سال چند اچھے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہوتا ہے وہاں دوسری طرف اُن سے کہیں زیادہ افسانہ نگار ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں افسانہ نگاری کے صحیح مفہوم تک کا پتا نہیں۔ اُن کی آنکھیں بند ہیں۔ بُرے بھلے کے دیکھنے اور پرکھنے کا امتیاز نہیں اس لئے جو کچھ کرتے ہیں وہ اُن کے لئے تو مضر ہے ہی لیکن اُس سے زیادہ ستم خود افسانہ پر ہے جو بجائے بلندی کی طرف چلنے کے پستی کا رُخ کرنے پر مجبور ہے۔ اس کی ذمہ داری اگر سچ پوچھا جائے تو ہمارے ادبی رسالوں پر ہے۔ ان میں سے چند مخصوص رسالوں کو چھوڑ کر باقی جتنے ہیں اُن میں آئے دن ایسے افسانے چھپتے رہتے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں افسانہ کہتے بھی شرم آتی ہے۔ وہ ادب میں ایک شرمناک اضافہ سے زیادہ نہیں ہیں، اس لئے اگر ہمیں اس بات کی تمنّا ہے کہ ہم اپنی افسانہ نگاری کو مغرب کے بلند آئین کے دوش بدوش دیکھیں تو ہمارے لئے پہلی چیز جس کی سخت ضرورت ہے، نظرِ انتخاب ہے۔ ہمارے رسالے بُرے افسانوں اور افسانہ نگاروں کو اپنے یہاں قطعی جگہ نہ دیں۔ صرف

فطرت، حقیقت اور نفسیات کے بے حد قابل قدر بلند نمونے بھی موجود ہیں۔ یہ سب چیزیں افسانہ نگاری کی بہت قلیل عمر میں اس میں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ ترقیاں بہت سے لحاظوں سے حیرت انگیز ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار ان خوبیوں اور بلندیوں کے علاوہ انھیں ہر مختلف طریقے سے اچھا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور موجود دور میں افسانوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اگر ہم آسانی سے انھیں دوسری قوموں کے افسانوں کے مقابلہ کے لئے نہیں پیش کر سکتے تو کم از کم یہ بھی نہیں کہ ہمیں اپنی بے مائگی کے احساس سے شرمندگی ہو۔ اس لئے اور بھی ہمارا دل ان ترقیوں کو دیکھ کر مستقبل کے بہت روشن اور امید افزا تصورات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی مختصر افسانہ نگاری کا مستقبل بے حد بلند ہے۔ اردو ادب کی کسی صنعت نے آج تک اتنی جلدی اتنی ترقی نہیں کی۔ ہر چیز معمولی حد تک آ کر رک گئی۔ لیکن افسانوں کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہے۔

یہ تیزی جہاں ایک طرف بے حد امید افزا ہے وہاں دوسری طرف اس میں یہ خرابی بھی ضرور ہے کہ اس شاہراہ پر چلنے والے کہیں اس قدر تیز نہ چلنے لگیں کہ انھیں راستہ کے خطروں کا

آٹھواں باب

مستقبل

اُردو کے افسانوں اور اُن کے مختلف رجحانات کے متعلق جو کچھ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے افسانوں میں محبت کے افسانوں کے علاوہ مغرب کی طرح اب مختلف قسم کے بلند افسانے لکھے جا رہے ہیں اور ان کی تعداد دن بدن زیادہ ہوتی جا رہی ہے - خود محبت کے افسانوں کی یہ حالت ہے کہ اُن میں سے وہ ساری قدیم اور فرسودہ روشیں غائب ہوتی جا رہی ہیں جو انھیں فطرت سے دور پھینک رہی تھیں - رومانی اور مثالی محبت کے بہترین مرقعوں کے علاوہ محبت میں نفسیاتی اور فطری پہلو زیادہ سے زیادہ شامل ہوتے جا رہے ہیں - اُن میں جہاں ایک طرف افسانوی دلکشیاں ہیں، وہاں دوسری طرف

عالمگیر دلچسپی اور شہرت کا سامان بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود افسانہ نگاروں نے ان چیزوں پر جس نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے وہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ اگر یہ کمی بھی کسی طرح پوری ہو جاتی تو "انگارو" میں ایک بہت بڑا حسن پیدا ہو جاتا۔

لیکن اس کے باوجود بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "انگارے" اُردو میں اپنی قسم کی بالکل نئی چیز ہیں۔ ان میں جذبات کی شدّت، اُن کے انقلابات، خیال کی جدّت اور تیکھاپن اور ان سب سے زیادہ طرزِ بیان کی تیزی، جدّت، آزادی اور بے باکی فن کے نزدیک بہت پسندیدہ چیزیں ہیں۔ اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر سے قطع نظر فن کے لحاظ سے سجّاد ظہیر اور رشید جہاں کے دو افسانے بے حد بلند ادبی نمونے ہیں۔ اُردو کو ابھی آئندہ آنے والے دَور میں اگر کسی چیز میں سب سے زیادہ ترقی کرنی ہے، تو وہ صرف فن ہے اور فن کی بلندی کے لحاظ سے اُردو والوں کو ان دو افسانہ نگاروں کا دست نگر ہونا پڑیگا۔ "انگارے" کے دوسرے افسانے بھی خواہ اور باتوں میں پھیکے اور بے کیف ہوں، لیکن فن کی جھلک ان میں سے قریب قریب ہر ایک میں ہے اور صرف یہی چیز "انگارے" کی آئندہ زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

جہاں ایک طرف چند افسانوں میں فن کا یہ حُسن موجود ہے
ہاں دوسری طرف بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن میں اعتدال کو
قائم نہیں رکھا جا سکا اور فن کے اظہار کے شوق میں یہ آزادانہ
اور بے باکانہ روش جو کچھ افسانوں میں ایک حُسن بن گئی تھی،
ایک قابل نفرت چیز بن گئی ہے۔ حقیقی شعاری کے شوق میں
واقعات کا انتخاب ایسا کیا گیا جو بجائے خود گندے تھے۔ حقیقت
کی بے حد عریاں تصویریں تھیں، ممکن تھا کہ لفظوں کا حُسن ان کا
پردہ پوش ہو سکتا، لیکن لفظ ان سے بھی زیادہ بھدّے اور سوقیانہ
چُنے گئے۔ اور جو چیز حقیقت میں ایک پر خلوص فن کار کی حیثیت سے
'حقیقت شعاری' کو بلند سے بلند طریقہ پر پیش کرنے کے لئے اختیار
کی گئی تھی وہ ایک بڑا عیب اور بد نما داغ بن گئی۔ ایسے افسانوں
میں 'بادل نہیں آتے'، سب سے نمایاں ہے۔

"انگارے" میں جہاں "خیال" اور "طرز بیان" کی نئی سے نئی
اور بلند سے بلند روایات کی تکمیل کی گئی وہاں اُن میں بحثیں بھی
اس قسم کی چھیڑی گئیں جن سے لکھنے والوں کے 'فطری اجتہاد'
کا پتا چلتا ہے۔ کچھ موضوع ایسے ہیں جن میں ہماری سوسائٹی خود
شدید سے شدید اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے بعض موضوع

ہر افسانہ میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں اُن پر حقیقت نگاری کا گہرے سے گہرا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ چنانچہ بعض افسانوں میں حقیقت نگاری کو نہایت کامیابی اور بلندی کے ساتھ نباہا گیا ہے مثلاً 'دلاری' کے عنوان سے جو افسانہ لکھا گیا ہے وہ اس کی اچھی مثال ہے ۔ یا "جنت کی بشارت" ایسے افسانوں میں خاص درجہ رکھتا ہے ۔ "نیند نہیں آتی" کو بھی اس حیثیت سے خاص درجہ دیا جا سکتا ہے ۔ مختصر یہ کہ ان دو تین افسانوں میں حقیقت نگاری کا فن اپنی بلند ترین خصوصیات کے ساتھ موجود ہے اور اس لئے فن کے نزدیک بے حد پسندیدہ اور قابل تعریف ۔

ان افسانوں میں ایک خاص بات جواب تک اردو میں عام نہیں، یہ ہے کہ الفاظ اور معنی کو حتی الامکان مرادف سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ خیالات کے اظہار کے خیال میں زبان اور محاورہ کی قیدوں کی قطعی پرواہ نہیں کی گئی ۔ آزادی اور بے باکی خیالات سے لے کر زبان تک اور ان دونوں چیزوں سے ہٹ کر مجموعی طرز بیان پر چھائی ہوئی ہے ۔ جوش، تیزی و تندی کے علاوہ جدت اور اختراع کو ہر جگہ کام میں لایا گیا ہے ۔ اس لئے فن کا حُسن ہر جگہ بڑھتا گیا ہے ۔

لذت اُٹھائے لیکن دُنیا کے سامنے وہ اخلاق کا ایک پسندیدہ مرقع بن کر آتا ہے، اس لئے اس 'رند زاہد فریب' نے حقیقت نگاری کی روش کو دوسروں کے سامنے ہمیشہ بُرا کہا۔ اور یہ خیال عام طور پر تنقیدوں کے ذریعہ سے عام ہو گیا کہ حقیقت بجائے خود بے حد اچھی چیز ہے حقیقت کے صحیح سے صحیح مرقعے ادب کی ہر صنف میں ہونے چاہئیں، خصوصاً افسانہ نگاری میں اس کی بہت سخت ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لفظوں میں اتنی آزادی، بے باکی، اور عریانی نہیں ہونی چاہئے۔

اس کے باوجود بھی جوائس کے افسانے حقیقت نگاری کے بے حد مکمل مرقعے ہیں۔ لیکن جہاں تک موضوع اور حقیقت کا تعلق ہے اُس سے قطع نظر جوائس کے افسانوں کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُن کا طرز بیان ہے۔ اور 'انگارے' کے مصنفین میں سے بعض کے یہاں اس طرز نگارش کے بے حد کامیاب نمونے موجود ہیں۔ جو خواہ کسی اور نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہ سمجھے جائیں لیکن فن اور اُس کی بلندیاں ان چیزوں کو اپنی بزم کی سب سے بڑی زینت سمجھتی ہیں۔

حقیقت نگاری کی جس روش کا ذکر کیا گیا اُس سے "انگارے" کے مصنفین میں سے ہر ایک بے حد متاثر ہوا ہے۔ اور قریب قریب

بھی ہیں جن کے اظہار کو اخلاق نے اب تک گناہ سمجھ رکھا تھا؛
اور اس لئے اُن کی حقیقی تصویریں بھی شاعرانہ تاویلوں اور فنی
عکسوں کے پردہ میں جلوہ گر ہوتی تھیں۔ لیکن اب شاعری اور
فن اس کے نزدیک صرف حقیقت کی سچی اور برہنہ مصوری کا نام
ہے۔ اس روش کے عام ہونے کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے ظاہر ہے۔
افسانوں میں حقیقی زندگی کے ایسے ایسے واقعات پیش کئے گئے
جنھیں ہماری آنکھیں، باوجود اُن کی صداقتوں پر ایمان رکھنے
کے، دیکھنا گوارہ نہیں کرسکتیں۔

خیال اُس وقت تک ہمارے دماغ پر بالکل اثر نہیں کرسکتا،
جب تک اُس کے اظہار کے لئے ویسے ہی لفظوں کو کام میں نہ لایا جائے۔
اس لئے حقیقت پسندی کی نئی روش کی ابتدا کے بعد لفظوں کی
دُنیا میں بھی ایک انقلاب ہونا ضروری تھا۔ ان برہنہ تصویروں
کے لئے عموماً ایسے لفظ استعمال کئے گئے جو کانوں پر ایک سخت
چوٹ کی طرح گونجتے تھے، ایسے لفظ جن میں معصیت کی ایک دُنیا
پوشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ انسان خود اخلاق کی پردہ دری کرے،
بداخلاقی کی معصیت کوش سرزمینوں کے ذرّے ذرّے سے اپنی
نظروں کو سیراب کرے، اُن سے زیادہ سے زیادہ

اُن کی ابتدا اُردو میں اصل میں نیازؔ کے یہاں ہو چکی تھی۔ لیکن لوگوں کی نظریں اُس طرف نہیں گئیں۔ "انگارے" کتابی صورت میں ہمارے سامنے آئے اس لئے ہم نے اُن پر توجہ کی نظر ڈالی۔ بہرحال "انگارے" اور اُن کی روش پر کوئی فنی اور ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے ہمیں یہ بتا دینے کی ضرورت ہے کہ افسانہ نگاری کی جو روش "انگارے" کے مصنفین نے اختیار کی ہے وہ اصل میں انگریزی کے ایک مشہور افسانہ نگار جیمس جوائس کی قائم کی ہوئی ہے۔ اور "انگارے" کے بہت زیادہ روشن اور قابل تحسین ٹکڑوں پہ جوائس کے طرز بیان کا کافی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

مغرب دن بدن مادّیت کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ ہر چیز میں حقیقت شعاری کے دیکھنے کا متمنّی ہے۔ افسانہ، شاعری، مصوّری، اور موسیقی میں اس کے لئے اُس وقت تک کوئی اثر نہیں جب تک یہ چیزیں حقیقت کی سچّی تصویریں بن کر اُس کے سامنے نہ آئیں۔ وہ ہر چیز اور اُس کی فطرت کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس کا سب سے بڑا اخلاق خود فطرت اور اُس کے پوشیدہ رازوں کی عقدہ کشائی ہے، اس لئے وہ جو کچھ دیکھنا یا سُننا چاہتا ہے اس میں اُسے صرف حقیقت کی تلاش ہے۔ دُنیا میں ایسی حقیقتیں

افسانوں کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو میں ادب لطیف نے بہت جلد ایک بلند درجہ حاصل کر لیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی اُردو میں افسانہ نگاری کی دو ایک روشیں ایسی ہیں جو افسانوں میں چند اور تقسیمیں پیدا کر دیتی ہیں لیکن اُنھیں ابھی اتنی اہمیت حاصل نہیں اور اس لئے اُن کی طرف توجہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس موقعہ پر ایک نئی قسم کے افسانوں کا ذکر نہ کرنا اردو پر ایک بہت بڑا ستم ہے۔ اُردو میں افسانوں کی ایک روش، جس نے اپنی آگ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلا دی وہ ہے جس کا مظاہرہ اب سے چند سال پہلے 'انگارے' کی شکل میں ہوا تھا۔ 'انگارے' اُردو افسانہ نگاری کی دُنیا میں ایک اجتہادی شان لے کر آئے۔ ظاہر میں تو یہ آگ کے دہکتے ہوئے ٹکڑے تھے، جنھوں نے ظاہر بینوں کی نظروں کو جھلس کے رکھ دیا، لیکن حقیقت کی نظریں ان دہکتے ہوئے انگاروں میں بھی نور کے کچھ تجلّی فیزا ذرّے تلاش کر کے رہیں۔ اور سراہنے والوں نے چند مجتہدینِ ادب، کی اس آزادانہ کوشش کو مستحسن نظروں سے دیکھا۔ 'انگارے'، جدلتوں اور انقلابوں کے جس نئی روش کے پیغامبر بن کر آئے تھے

سی خاص وجہ سے نفسیاتی کہتے ہیں۔ اُردو میں اب یہ روش بے حد
عام ہوگئی ہے کہ ہر قسم کے افسانوں میں کم از کم نفسیات اور اس کے
گہرے مشاہدہ کا اظہار ہو۔ چنانچہ اچھے افسانہ نگاروں کے رومانی،
تخیلی، جاسوسی، روحانی، دیو بانی اور ہیبت ناک ہر قسم کے افسانوں
میں نفسیات کو بہت کافی دخل ہے۔

ان افسانوں کے علاوہ ایک نہایت لطیف قسم کی چیز اُردو
کی افسانوی دُنیا میں داخل ہوگئی ہے۔ اور اسے حقیقتاً نفسیات اور
اس کے گہرے مشاہدے کے علاوہ، ڈرامائی اثرات سے بہت گہرا
تعلق ہے۔ اس چیز کو اُردو میں 'ادب لطیف' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔
ادب لطیف' اصل میں ایسے شعر ہیں جنھیں شاعری کی رسموں اور
قیدوں سے آزاد رہنے والے صرف نثر کے لباس میں ہم تک پہنچاتے
ہیں۔ اُدب لطیف' کے رنگ میں ڈوبے ہوئے مختصر افسانے بھی
اُردو والوں کی نہیں بلکہ بنگالیوں کی ملکیت ہیں۔ جنھیں مغرب اور
خود اُن کی فطرتوں نے ایسے رنگ میں رنگا ہے کہ ہر نظر انھیں
محبت سے دیکھتی ہے اور ہر دل انھیں پیار کرتا ہے۔ ہمارے مشہور
افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم اور حجاب اسمٰعیل کے یہاں اس
قسم کی چیزوں کی کافی تعداد ملے گی اور ہم ان دونوں کے ایسے

اور پوشیدہ چیز کا لفظی عکس ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں، ہم جو کچھ سوچتے ہیں، ہم پر مختلف چیزیں جو اثر کرتی ہیں، ہم مختلف مادّی چیزوں کو دیکھ کر یا اُن کے ذکر سے، اُن کے خیال سے، اپنے آپ میں جو ذہنی تبدیلیاں محسوس کرتے ہیں وہی سب نفسیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس لئے ایسے افسانے جن میں بجائے کسی مادّی چیز کو نمایاں کرنے کے افسانہ نگار ہمارے ذہنی، جذباتی اور احساسی رجحانات اور کیفیات کی مصوّری کرے، ہماری مختلف تحریکات کو لفظی جامہ پہنائے، نفسیاتی کہلاتے ہیں۔
نفسیاتی افسانوں کا رواج اُردو میں اُس وقت سے زیادہ ہوگیا ہے جب سے روسی افسانہ نگاروں میں "چیخوف" اور "ٹرگینیف" کے اور فرانسیسوں میں "موپساں" کے افسانے ہماری زبان میں منتقل ہونے شروع ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جن افسانہ نگاروں نے ان کے ترجمے کیے، اُن کے طبع زاد افسانے بھی اسی نفسیاتی رنگ میں ڈوب گئے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں سب سے نمایاں مثال جلیل قدوائی کی ہے۔

نفسیاتی افسانوں کے ذکر کے بابت محض ایک چلتا پھرتا جملہ بھی کہنے کی ضرورت ہے کہ اُن افسانوں کے علاوہ جنھیں ہم

واقعاتی افسانوں کی یہ روش بڑھتے بڑھتے اب ایسی حقیقتوں کی پردہ دری کرنے لگی ہے کہ ہمارا دل ان پر ہیبت مناظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔

چنانچہ مضحک دہلوی کے ہیبت ناک افسانے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، یا اسلم کے افسانے "گناہ کی راتیں" اس قسم کے افسانوں کی نمایاں مثالیں ہیں۔ مضحک دہلوی کے افسانے حقیقت میں فطری اور غیر فطری عناصر کا مجموعہ ہیں، اس لئے اُنھیں ہیبت ناک کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ اسلم کے افسانے ہیبت ناک تو نہیں، لیکن کم از کم ایسے واقعات کی مصوری ضرور کرتے ہیں جن میں ہیبت، عبرت اور فطرت کے بعض بعض موثر نمونے ہیں۔ اس قسم کے افسانے بھی اُردو میں رفتہ رفتہ ترقی کر رہے ہیں۔

واقعاتی افسانوں کے علاوہ نفسیاتی افسانے بھی کم و بیش اسی حد میں آ جاتے ہیں جن میں واقعاتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ واقعاتی افسانے کسی مادی چیز، کسی انسانی زندگی کے واقعے، کسی مقام اور اُس کی خصوصیتوں کی ایسی مصوری کرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ مخصوص چیز، زندگی کا پہلو یا مقامی منظر ہماری نظروں کے سامنے پھر جائے نفسیاتی افسانے اس کے بالکل خلاف کسی مادی نہیں، بلکہ اندرونی

تلوّن مزاج انسان اُس سے اُکتا کر دوسری چیزوں کا والہ و شیدائی ہونے لگتا ہے۔ ہماری افسانہ نگاری میں بھی اب یہ چیز بے حد نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ ہمارے اچھے افسانہ نگاروں میں سے کم ایسے ہیں جو صرف محبت کے افسانے لکھتے ہیں، بلکہ اُس کے بجائے اُنھوں نے اس طریقہ کو زیادہ پسندیدہ بنا رکھا ہے کہ اپنی اور اپنے گرد و پیش کی زندگی کے معمولی اور روزانہ کے واقعات کو افسانہ کی شکل دے کر، انسان کو اُن چیزوں کی طرف متوجہ کریں جن سے وہ اب تک بیگانگی برتتا رہا ہے اور جن کی طرف وہ توجہ کرنا بھی ایک گناہ عظیم سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند۔ سدرشن حسینی اور اعظم جہاں کبھی کبھی کوئی محبت کا افسانہ لکھتے ہیں، وہاں دوسری طرف زیادہ موقعوں پر وہ اپنے افسانے میں ہماری زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ واقعہ معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ افسانوی شکل بھی حاصل کر لے۔ چنانچہ پریم چند اور سدرشن کے لکھے ہوئے صدہا افسانوں میں کسی نہ کسی مقامی خصوصیت یا اُس کے کسی نہ کسی واقعہ کو پلاٹ کے لئے کام میں لایا گیا ہے۔ ایسے افسانے اب دن بدن دوسرے افسانوں کے مقابلہ میں زیادہ مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ

مضامین کے علاوہ اس میں بہت سے افسانے بھی ایسے شائع ہوئے
جن کا تعلق اِن 'دیوبانیات' سے تھا۔ اس کے علاوہ 'مرقع لکھنؤ' میں
بھی اس طرح کے چند افسانے چھپے اور یہ سب پسندیدہ نظروں سے
دیکھے گئے۔ اس قسم کے زیادہ افسانے اُردو میں مجنوں گورکھپوری
نے لکھے ہیں اور ان کا ایک دلچسپ مجموعہ سمن پوش کے نام سے شائع
ہوچکا ہے۔ سمن پوش کے سب افسانوں پر اسی مافوق الفطرت اور
بعید از عقل عنصر کا غلبہ ہے لیکن اس میں ہر جگہ اُن نظریوں کی تکمیل
کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مدّتوں سے اس سلسلہ میں حقیقت کے
لباس میں دُنیا کے سامنے پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ افسانے اپنی نوعیت
کے لحاظ سے بے حد دلچسپ اور فن کے لحاظ سے بلند ادبی نمونے ہیں۔
دوسرے اچھے لکھنے والے بھی اگر اس روش کو اختیار کرسکیں تو اچھا ہے۔

افسانے اصل میں ہماری زندگی کے مختلف ٹکڑوں کے خاکے ہیں،
جنھیں افسانہ نگار تھوڑی بہت فنی دلکشیوں کے آب و رنگ کے بعد
ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسے بالکل اتفاق کہئے کہ اب تک
لوگوں نے افسانہ نگاری کو صرف محبت کے لئے مخصوص کر رکھا تھا محبت
بھی ایک حقیقت ہے اور دُنیا کی دوسری حقیقتوں کے مقابلہ میں
پر کیف بھی ضرور ہے، لیکن جب دُنیا کی ہر چیز پر محبت چھا جاتی ہے تو

دُنیا کا قاعدہ ہے کہ جب پُرانی چیزوں سے گھبرا جاتی ہے تو اُن کی جگہ نئی سے نئی چیزیں اختیار کی جاتی ہیں۔ ادب میں یہ روش برابر اپنا اثر دکھاتی رہتی ہے۔ کوئی زمانہ اور کوئی ادبی دور انسانی فطرت کی اس جدت پسندی، اور تلوّن مزاجی کے اثر سے خالی نہیں۔ ہماری قدیم داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر، جن میں بھوت، جن، دیو اور پری کو سب سے زیادہ دخل تھا، بہت کثرت سے تھے، ادب کا کوئی نقّاد ایسا نہیں جس نے اُردو کی اس روش کا ذکر کرتے وقت ناک بھوں نہ چڑھائی ہو۔ جس نے اس دور کا ذکر کیا اُس کی تیوریوں پر بل ضرور آئے، اُس نے مُنہ ضرور بنایا، اُس نے اسے اُردو کی داستان گوئی کا ایک غیر فطری، اور غیر دلکش عنصر ضرور قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب ادب کے مجتہدین نے ان چیزوں کو مٹا کر فنا کر ڈالا، ان کا نام و نشان تک نہیں رہا، تو لوگوں کی طبیعتیں پھر انھیں قدیم غیر فطری چیزوں کے لئے مچلنے لگیں۔ دل کو پھر انھیں مزوں کی تلاش ہوئی، اُردو کی مختصر افسانہ نگاری میں اس چیز نے ایک خاص حیثیت حاصل کر لی، اور اب سے کئی برس پہلے لکھنؤ سے ایک رسالہ 'جن' کے نام سے نکلنا شروع ہوا، جس میں ہماری فطرتوں کی اس نئی پیاس کو سیراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف قسم کے

افسانے اب تک اُردو میں لکھے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انگریزی افسانوں کے اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یا تو یہ آزاد ترجمے ہیں، یا افسانہ نگاروں نے محض پلاٹ کو لے کر اُسے ہندوستانی فضا کے مطابق بنا کر اُنھیں اپنا کرلیا ہے۔ کہیں صرف تحریکی جذبہ کی مدد لی ہے اور اُس کے بعد ڈھانچے میں اپنی خیال آرائیوں اور جدّتوں کی مدد سے جان ڈال کر ایک افسانہ تیار کرلیا ہے۔ چونکہ اس قسم کے افسانوں کا ابھی زیادہ رواج نہیں اس لئے اُردو میں اُس کے فن کی طرف بھی کم توجہ کی گئی ہے۔ چونکہ ایسے افسانوں کی ابتدا انگریزی کی تقلید سے ہوئی ہے اس لئے اُمید ہے کہ اگر ترجمہ کرنے والوں نے سمجھ سے کام لیا تو ان افسانوں کا فن خود بخود اُردو میں آجائے گا اور بعد میں لکھنے والے افسانہ نگار بجائے اس کے کہ جاسوسی افسانوں کے فن کے لئے کسی مصنف کے محتاج ہوں۔ محض ان اچھے نمونوں کو دیکھ کر فائدہ حاصل کرسکیں گے۔

جاسوسی افسانوں کی جو اکّا دکّا مثالیں ہمیں مختلف رسالوں میں نظر آتی ہیں ان کے علاوہ طالب الہ آبادی نے چند جاسوسی افسانوں کا مجموعہ بھی شائع کردیا ہے۔ افسانے دلچسپ ہیں اور اس فن کے اچھے افسانے کہے جاسکتے ہیں۔

چند دوسرے جام

ایسے افسانوں کے علاوہ جو ہمارے افسانہ نگاروں نے محبت کے کسی جذبہ کی ترجمانی کے لئے لکھے ہیں، اور جن میں کسی نہ کسی طرح محبت اور اُس کے مخصوص اثرات جلوہ گر ہیں، ہماری زبان میں اور بھی مختلف قسم کے افسانوں کا رواج ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کی تعداد محبت کے افسانوں کے مقابلہ میں اتنی کم ہے کہ اُن کا صرف مختصر سا تذکرہ بہت کافی ہے۔ ایسے افسانوں میں سے جس قسم کے افسانوں پر ہماری نظریں زیادہ پڑتی ہیں اُن میں سے جاسوسی، روحانی، واقعاتی اور نفسیاتی افسانوں کے علاوہ ادب لطیف اور ہیبت ناک افسانے ذرا زیادہ اہم ہیں۔

جاسوسی افسانوں کی تعداد اُردو میں ابھی کم ہے اور جو کچھ

"محبت ایک نغمہ ہے، جو کائنات کے ہر گوشہ میں گونجتا ہے"۔

اس طرح کی چیزیں ہمیں اپنے افسانوں میں کثرت سے ملیں گی۔ وہ افسانے جن میں نفسیات محبت اور فطرت اپنی انتہائی بلندیوں کو پہنچ چکی ہوتی ہے، ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ زمانہ کی ضرورتیں اور افسانہ نگاروں کی فطرتیں یکساں نہیں۔ اس لئے نفسیات میں شاعری، حقیقت اور فطرت میں دوسری دلکشیاں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ رومان جہاں ایک طرف نفسیات کا پابند ہے وہاں دوسری طرف شاعرانہ نغمے اس کے گرد و پیش ہیں۔ محبت کا دیوتا نفسیات کے حلقہ میں بے حد حسین معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے شاعرانہ فطرتیں اس کی لفظی ترجمانی صرف شاعرانہ لفظوں میں کرتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ جب تک یہ شاعرانہ مرقعے حقیقت شعری کی حد میں ہیں بجائے بُرے لگنے کے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔

خیالات، رجحانات اور مختلف احساسات، ہر چیز نفسیات اور فطرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، کبھی کبھی محبّت کے متعلق ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہیں، اُس کی شان میں ایسی مدحت سرائیاں کرتے ہیں جو محبّت کی نفسیاتی فطرت اور فلسفیانہ حقیقت کے بالکل منافی ہے۔ مثال کے لئے اپنے دو ایک مشہور افسانہ نگاروں کی زبانی اس کی تعریف سُنئے۔

مجنوں کا افسانہ "بیگانہ" ایک نہایت بلند نفسیاتی محبّت کا افسانہ ہے اُس میں محبّت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"زندگی کا راز الفت ہے۔ اگر الفت نہ ہوتی تو آج کائنات میں کوئی نظام نہ ہوتا۔ آدمی کی سرشت محبّت ہے محبّت آدمی میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے"

"محبّت ایک مقدّس حقیقت ہے جو زندگی کو بھی ایک حقیقت بنائے ہوئے ہے"

ایک دوسرے افسانہ میں کہا ہے۔

"محبّت ہر چیز کی اصلیت ہے۔ قدرت کی روح، آدمیت کی جان۔ محبّت بغیر زندگی کے جنجال ہے"

ایک دوسرا افسانہ نگار لکھتا ہے۔

کو کبھی آسانی سے ممکن نہیں۔ اس کی وجہ بھی صرف نفسیات اور فطرت کی پابندی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص کو دنیا میں کوئی نہ کوئی چیز عزیز ہونی ضروری ہے، اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ چیز صرف عورت ہی ہو۔ اس لئے جن افسانوں میں محبت کے اس جذبہ کی ترجمانی گئی ہے وہ بھی کم اثر کے مالک نہیں ہیں۔ ایسے افسانے ہمیں سجاد حیدر، مجنوں، اعظم، حامد علی خاں، حسینی، پریم چند اور سدرشن کے علاوہ ایسے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں جو دوسری زبانوں کے ترجمے کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہمارے افسانوں کی محبت اور اس کے ہر پہلو پر نفسیات اور فطرت نے کافی گہرا اثر پیدا کر لیا ہے اور مختلف قسم کے اچھے افسانوں میں نفسیات کے کافی گہرے اور بلند مطالعہ کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایک چیز جو بے حد حیرت انگیز ہے یہ ہے کہ ہمارے وہ افسانہ نگار جو محبت اور اس کے فلسفہ اور نفسیات سے واقف ہیں، جنھیں اس کی فطرت پر کافی گہرا عبور ہے۔ اور اپنے افسانوی کرداروں کو ہمارے سامنے پیش کرتے وقت برابر نفسیاتی بلندی اور فطری باتوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ وہ اُسی افسانے میں، جہاں واقعات، پلاٹ، اُن کے کرداروں کے

ایک مثال ہے۔ ہمارے اچھے افسانہ نگار اب قدم قدم پر ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اگر محبت اور اس کی مختلف کیفیتوں کو مذہب اور اس کی قیود سے آزاد جانتے ہیں تو بھی اس کا اظہار افسانوں میں آزادی سے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ہندوستانی اس قسم کی باتوں کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں انھیں اس کی معقول اور زیادہ سے زیادہ فطری اور نفسیاتی، دنیاوی وجہیں دکھانی پڑیں گی جو خود اُن کے نزدیک نہیں بلکہ عام فطرت انسانی کے نزدیک مناسب اور قابل قبول ہوں۔ ایسے افسانے ہمیں مجنوں کے یہاں کثرت سے ملیں گے۔

ہمارے افسانوں میں محبت کا ایک اور رجحان جو اب دن بدن عام ہوتا جا رہا ہے یہ ہے کہ افسانہ نگار صرف عورت اور مرد کی معمولی رسمی اور فرسودہ محبت سے الگ ہو کر دنیا کی دو کسی مختلف چیزوں کی محبت کے جذبہ کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتے ہیں۔ کہیں ماں، باپ، بھائی، بہن اور دوست کی محبت میں وہ اثر اور لطف پیدا کیا گیا ہے جو عورت اور مرد کی محبت میں۔ کہیں آقا اور خادم کی محبت، کہیں آدمی اور جانور کی محبت، اور کہیں محض کسی خاص جذبہ اور خیال کی محبت میں افسانہ نگار وہی اثر پیدا کر دیتے ہیں جو اور قسم کی محبتوں میں

یہ بھی صرف اس لئے دلکش معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی ابتدا میں فرسودگی نہیں، ان کے انجام فطرت کے مطابق ہیں، ان میں جو کچھ کہا گیا ہے، جو کچھ پیش کیا گیا ہے، جو نتائج دکھائے گئے ہیں اُن سب پر فطرت اور نفسیات چھائی ہوئی ہے۔ ہر چیز خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، ہر جذبہ خواہ بلند ہو یا پست، ہر عمل خواہ محمود ہو یا معیوب، کسی نہ کسی خاص وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ کوئی چیز بغیر وجہ کے نہیں۔ تحریک اور اس کا عمل چھوٹی اور بڑی ہر چیز میں ہے۔ اس بات کا خیال ہمارے اچھے افسانہ نگار ہر موقعہ پر رکھتے ہیں۔ وہ اگر اپنے افسانوں میں محبت کا ایسا نظریہ پیش کرتے ہیں جو ہندستانیوں کی فطرت اور یہاں کی روایات کے نزدیک اچھا یا مستحسن نہیں تو اس کے ساتھ ساتھ وہ پلاٹ اور اس کے واقعات کی ترتیب اور اس کے پس منظر کو ان چیزوں کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ کوئی افسانہ نگار اگر کسی ہندوستانی دوشیزہ اور ایک نوجوان کے درمیان ایک آزادانہ محبت کے جذبات کا عمل دکھا رہا ہے۔ ان کے تعلقات، ان کی گفتگو، اور ان کی روش میں، ہر جگہ آزادی موجود ہے جو فطرتاً ہندوستان میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی تو وہ ایسے افسانوں میں ان کے ہیرو اور ہیروئن کو تعلیم یافتہ دکھانے پر مجبور ہے۔ یہ صرف

بلند ترین نمونے ہیں اور اُن کی تقلید کرنے والا، اُن کے راستہ پر چلنے والا، آسانی سے اپنے آپ کو بلندی کی طرف مائل یا محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود بھی ان کے خیالات، جذبات، احساسات، جذباتی کشمکش، عمل اور کردار، ہر چیز فطرت اور نفسیات کی پابند ہے۔ ان میں انقلابات بھی رونما ہوتے ہیں، مختلف تبدیلیاں بھی ان پر اثر کرتی ہیں، ان کی فطرتوں کو بھی مختلف ہیجانات اور کشمکشوں کے درمیان ہو کر گذرنا پڑتا ہے، اور ان سب موقعوں پر یہ جو کچھ کرتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں، جس طرح ان چیزوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور جس طریقہ سے کسی اچھے سے اچھے نتیجہ پر پہنچتے ہیں، یہ سب چیزیں جہاں ایک طرف مثالی محبت کی نظیر ہوتی ہیں وہاں فطرت انسانی اور نفسیات کے منافی بھی نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہمیں اپنے افسانوں کی مثالی محبت میں ایک خاص کیف اور بلندی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے افسانوں کی کافی مثالیں ہمیں نیازؔ، سجاد حیدر، مجنوںؔ، حسینیؔ اور قیسیؔ کے افسانوں میں آسانی سے مل سکتی ہیں۔

ہمارے مختصر افسانوں میں رومانی اور مثالی محبت کے افسانوں کے علاوہ دوسری قسم کی محبتوں کے بھی کافی نمونے موجود ہیں اور

تو شاعرانہ مبالغہ کے بغیر اس کی حقیقتیں نہایت تلخ اور بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ہمارے افسانہ نگاروں میں سے جن جن نے رومانی محبت کے افسانے لکھے، اُن کے یہاں نفسیات اور نفسیاتی تخئیل کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ رومانی افسانہ نگاروں میں نیاز فتحپوری اور سجاد حیدر کے افسانہ اردو کے افسانوی ادب میں سرمایہ ناز چیزیں ہیں۔ اور ان دونوں رومان پرست افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھنے کے بعد ہمیں جہاں ایک طرف رومانی محبت کے بہترین شاعرانہ مرقعے ملتے ہیں وہاں دوسری طرف نفسیات اور فطرت کا اُن کے اوپر اتنا گہرا اثر ہے کہ ہم زرا سی دیر کو بھی ان شاعرانہ مبالغوں سے مکدّر نہیں ہوتے۔ اُن کی شاعری نفسیات کی پابند ہے اور ان کی نفسیات فن اور اس کی لطیف بلندیوں کی حامل۔ اس لئے قدیم رومانی جذبہ اور اس فطرت اور نفسیات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے رومان میں ہمیں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ہماری فطرتیں انھیں پڑھ کر بلندی کی طرف جاتی ہیں۔

رومانی محبت کے علاوہ مختصر افسانوں میں مثالی محبت کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک نہیں بیسوں اچھے افسانے موجود ہیں۔ ان کے عاشق اور معشوق اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور محاسن کے اعتبار سے

ۂداقت اور امکان کی کوئی دھندلی سی تصویر بھی اپنے ذہن میں
ہیں قائم کر سکتا - ورنہ قدیم افسانوں میں جتنی مختلف چیزیں ہیں
ا سب کی بنیاد ایک ایسی حقیقت پر ہے جو بجائے خود قابل قبول
ی ہے اور فطرت اور نفسیات کی پابند بھی - ان میں خرابی صرف
ہے کہ اعتدال کسی جگہ نہیں -

اُردو میں جب سے مختصر افسانوں کی بنیاد پڑی زیادہ تر افسانے
ہی لکھے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے فطرت انسانی کا قوی ترین
، محبت ، حکمراں رہا - لیکن فرق صرف یہ ہے کہ مختصر افسانوں
بتدا کے ساتھ ہی اس میں ایسی روشیں عام ہو گئیں جنھوں نے
ت کو 'فطرت' اور 'نفسیات' کا پابند کرنا شروع کر دیا - اور رفتہ رفتہ
ہمارے افسانے ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں مبتدیوں
سانوں کو چھوڑ کر ، اچھے لکھنے والوں کے افسانوں میں فطری محبت
سیات کی بلندی کی کمی نہیں محسوس ہوتی -

محبت کے جن مرقعوں میں مبالغہ اور غیر فطری عناصر کے شامل
کی زیادہ گنجائش ہے وہ ہمیں عموماً رومانی اور مثالی افسانوں میں
ے ہیں ، افسانوں کی دونوں قسموں کے لوازم فطری طور پر کچھ
لے ہیں کہ اُن میں شاعرانہ مبالغہ ایک حسن پیدا کرتا ہے - بلکہ کبھی کبھی

ہر بڑے سے بڑا عاشق، معشوق کے لئے صرف اس لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا کہ اُسے آخر میں صرف اپنے پوشیدہ وحشیانہ جذبات کی تکمیل منظور تھی - چنانچہ اکثر موقعوں پر اس کا شدید اظہار بھی ہوجاتا تھا -

اِن افسانوں میں بعض عاشق ایسے بھی ہیں جو محبوب کو صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ محبت بجائے خود ایک دلفریب چیز ہے - اُن کا مقصد محبوب کو حاصل کرنا نہیں بلکہ محبت کے بلند ترین روایات کی تکمیل ہے - وہ صرف محبت کے پرستار اور اُس کے بندے ہیں، محبوب سے اس لئے انھیں اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ وہ ان کو معبود حقیقی کے حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے - یہ جذبہ بھی جہاں ہے وہاں حد کو پہنچ گیا ہے -

مختصر یہ کہ قدیم افسانوں میں محبت جتنے مختلف طریقوں سے پیش کی گئی ہے - اِن داستانوں میں عشق و محبت کے جو جو مختلف مرقعے ہمیں نظر آتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ اور غلو ہے - مثالیت ہے تو وہ غلو کے ساتھ، حسن اور عشق کی مصوری ہے تو وہ انتہائی مبالغہ کے ساتھ، محبت کا کوئی نظریہ ہے تو حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو کا شکار، اور مبالغہ بھی ایسا کہ ہمارا ذہن اس کی

پہلا حصہ تو وہ ہے جسے ہم مثالیت کا تابع پاتے ہیں۔ اکثر افسانوں میں عورت اور مرد کی محبّت دکھائی گئی ہے اور یہ محبت ہر موقع پر ایک ایسی منزل اور درجہ تک پہنچ جاتی ہے جہاں سے آگے وہم وخیال کی گنجایش بھی مشکل ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت، ہر عاشق اور معشوق، محبّت کے انتہائی مرکز تک پہنچنے کا عادی ہے دُنیا کی کوئی رکاوٹ، نفسیات کی کوئی کشمکش، اور واقعات کی کوئی اہم سے اہم کڑی، ان کے نظریۂ محبّت کے درمیان حائل نہیں ہوتی۔ وہ محبّت کے دام میں پھنس کر صرف اُسی کے ہو جاتے ہیں اور زندگی پھر صرف اُسی کے ہو کر رہ سکتے ہیں۔ یہ وہ صفتیں ہیں جو ہر چاہنے والے میں اور اُس کے ہر محبوب میں نظر آئیں گی۔ عاشق ہمیشہ وفا، جاں نثاری، بہادری، دلیری اور ایثار کا پُتلا ہوگا۔ معشوق ہمیشہ حُسن، عشوہ وناز، پاکبازی اور حیا کا نمونہ۔ غرض یہ کہ قدیم افسانوں میں یہ چیزیں اچھائی کی اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ ہرگز قابل یقین نہیں رہتیں، اور پڑھنے والا اِن میں حقیقت کی شدید کمی محسوس کرکے اُنھیں صرف وقت گزارنے کے لئے پڑھتا ہے۔

قدیم افسانوں کی محبّت میں عموماً ایک عورت اور مرد کی محبت کا انتہائی مقصد صرف وحشیانہ جذبات کی تکمیل تھا۔

کی داستانیں دہرائی گئی ہیں اگر ادب سے الگ کرلئے جائیں تو ان کی روح ان سے الگ ہوجائے گی۔ ان کا وہ حصّہ ان سے الگ ہوجائے گا جسے ہم سامان حیات کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہماری زبان اور ادب کا بہترین سرمایہ بھی اُسی پردہ میں پوشیدہ ہے جسے دُنیا محبت کہہ کر پکارتی ہے۔

اُردو کی شاعری، اور اُس کے نثری ادب اور اُس کی ہر صنف پر محبت نے شروع ہی سے اس قدر گہرا اثر جمایا ہے کہ اس کے سارے کیف اور سرمستی کا مرکز صرف محبت بن کر رہ گئی ہے۔

ہمارے افسانوں میں سے، خواہ وہ قدیم اُردو کے دور میں لکھے گئے ہوں، خواہ اُن پر فورٹ ولیم کالج اور اُس کے فطری اثر کی رنگ آمیزی ہو، خواہ اُس میں اُن ما فوق الفطرت قصّوں کو شامل کرلیا جائے جن کے لاکھوں صفحے ہمارے ادب کا ایک بہترین سرمایہ سمجھے جاتے ہیں، یا ان سب سے الگ اگر ہم ناولوں کی دنیا میں آکر دیکھیں، تو ہمیں شائد ہی کوئی قصّہ، داستان، افسانہ یا ناول ایسا ملے گا جس میں کسی نہ کسی طرح محبت کو دخل نہ ہو۔ لیکن یہ محبت کسی جگہ، کسی دَور میں، اور کسی مصنف کے یہاں شکل سے فطری اور نفسیاتی حدود کی پابند نظر آئے گی۔ ہمارے قدیم افسانوی ادب میں جس محبت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اُسے مختصر طور پر کئی حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

چھٹا باب

محبّت اور نفسیات

ادب کا کوئی حصّہ نہیں جس میں محبّت کی رنگ آمیزیوں کی جلوہ فرمائی نہ ہو۔ اس کے بہتر سے بہتر حصّے، اس کے وہ حصّے جو ایک ادب کے لئے سرمایۂ ناز اور دوسرے کے لئے رشک اور حسد کے حامل بن کر آتے ہیں ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح محبّت اور اُس کے فتنہ سامان اثر موجود ہیں۔ یورپ کے سب ادب، فرانس، روس، اٹلی اور انگریزی ادیبوں کے سب سے زیادہ کیف آور ادبی مرقعے محبّت کے نغموں میں ڈوب کر نکلے ہیں۔ ترکی، مصر، یونان و روما کے علاوہ عرب اور فارس کے بہترین ادبی جواہر پارے وہی ہیں جن میں محبّت کے راگ گائے گئے ہیں ۔ ہمارے ملک میں سنسکرت، ہندی، مرہٹی اور بنگالی ادب کے وہ حصّے جن میں اس عالمگیر جذبہ

کی حرکت کو ایک شعر کی کیفیت اختیار کرتے دیکھا جس سے بےجان زمین میں جان پیدا ہوگئی تھی۔ ایک دوسرا رومان پرست افسانہ نگار عورت کو "آزاد، رمیدہ، آغوش سے دور" کہہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا ہے۔ کبھی وہ اُسے دُنیا کی "محترم ترین مخلوق، ہم پر حکمراں، ایک مجسم لذّت، ایک تسکین مشکل، ایک سحر مرئی، اور نور مادّی" کہہ کر اپنے رومان پرست جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تصویریں روحانیت، رومان، شعر، موسیقی اور سحر کی مجسّم تصویریں ہیں۔ ان تعریفوں میں ایک پیکر محسوس روحانی سرور کا مجسّمہ بن کر ہمارے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ ہم اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اُس کی ساحرانہ اور خیالی تصویر کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ہم صرف تھوڑی ہی دیر کے بعد فطرت کی اس لطیف تخلیق کو اپنی نظروں سے بے حد بلند، اپنی دُنیاؤں سے دور اور اپنی فضاؤں سے الگ محسوس کرکے مادّی کیف اور سرور سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔ یہ بیگانگی ہمیں صرف اس لئے غنیمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہمیں فن کی سحر کاریوں کے زیادہ سے زیادہ قریب لاتی ہے، اور یہی اس کا سب سے بڑا حُسن ہے۔

کہ ادبی تخلیقیں بھی اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی نکلتی ہیں۔ اُردو افسانہ نگاروں نے مغرب کے اِس اثر کو اس مبالغہ کے ساتھ قبول کیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں کہیں عورت کی فطری خوبیوں پر بھی مبالغہ کا شبہہ نہ ہونے لگے۔

یہ سچ ہے کہ عورت کی فطرت آزاد رہنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے کہ مرد اُسے کھو کر ابدی مسرت حاصل نہیں کر سکتا۔ اُسے پیدا ہونے سے مرنے تک برابر ماں، بہنوں اور بیوی کی محبّت کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کی مائیں، بہنیں، بیویاں اِسی دُنیا کی ہوں۔ حُوریں، پریاں یا دیویاں نہیں۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں سے ایک نے ایک جگہ عورت کا ذکر اِن لفظوں میں کیا ہے۔ ”عورت کے ہاتھ میں ایک مسیحائی اثر ہے! اُس کا ذرا سا اشارہ، اُس کا خفیف سا سہارا، برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ دُکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے“ اسی افسانہ نگار نے عورت کی ایک دوسری جگہ اس طرح مصوری کی ہے۔

”اُس نے اسی رات اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ موسیقی کو ایک زندہ عورت کی شکل میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا، جس کے نغمے کی اُٹھتی ہوئی لَے ہوا کے ذرّوں کو حسین بنا رہی تھی۔ اُس نے اُس رات ایک عورت کے پاؤں

ذہنیتیں بتائی گئیں اُن میں سے ہر ایک نے عورت کو کسی نہ کسی حُسن سے تشبیہ دی ہے۔ خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی، خواہ اُس کا تعلق اس دنیا سے ہو خواہ دوسری دنیا سے۔ ان کے نزدیک عورت پری بھی ہے اور حور بھی اُس میں پھولوں کی مہک بھی ہے اور تاروں کی چمک بھی۔ اُس کا ظاہر بھی دلفریب ہے اور باطن بھی دلکش لیکن بعض افسانہ نگاروں کے نزدیک دُنیا کی تمام بُرائیوں کا مرکز صرف عورت ہے۔ اُس کا حُسن ظاہر بیں نگاہوں کے لئے دلکش ضرور ہے لیکن اس کا انجام خوفناک، افسان میں فطرت نے جتنے بھی جذبات پیدا کئے ہیں اُن سب کو صرف عورت اُبھارتی ہے اور مرد اپنے آپ کو بڑے سے بڑے گناہ سے بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ ایسے لوگوں کے نزدیک عورت دُنیا کی سب سے بُری مخلوق ہے جورت کی ایسی تصویریں عموماً آج کل کے بعض نوجوان افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہیں۔

میرے ایک دوست صرف اس مقصد کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے لکھتے ہیں کہ عورت صرف محبّت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس کی فطرت اتنی والہانہ ہے کہ وہ دُنیا میں اس کے سوا اور کچھ کام نہیں کر سکتی کہ لوگ اُس سے محبّت کریں اور وہ اس کا اثر لے۔ مجھے یہ افسانے سُن کر حیرت ہوگی۔ مغربیت نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر اس قدر گہرا اثر ڈال رکھا ہے

ان بلند منزلوں کی طرف کھینچتا ہے۔ لوگ ان تصویروں کو پرعظمت نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے ذہن میں یہ خیال جما لیتے ہیں کہ ہم جس چیز کو دیکھ رہے ہیں وہ ہماری دُنیا سے بالکل الگ ہے۔ ایسے موقع پر اِندر کے دربار کی اپسرائیں، پرلوک میں بسنے والی دیویاں یا گوکل کی گلیوں یا بندرا بن کے جنگلوں میں گشت لگانے والی گوپیاں بھی اِن خیالی مجسّموں کا آسانی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

یہی ذہنیت ذرا اور بدلتی ہے تو حُسن کے متوالے عیبوں میں بھی حُسن ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ بعض افسانہ نگاروں نے عورتوں کو اس قدر بلند مرتبہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کے عیبوں کو بر تاویلوں کے دلچسپ رنگ چڑھا کر انھیں بھی دلفریب بنا دیا۔ کسی عورت کی بُرائی کو اُس کی فطرت کی طرف منسوب کر دیا، کسی کو عشوہ و ناز کہہ کر ٹال دیا اور کسی جگہ کوئی اور تاویل کر دی اور کوشش کی کہ افسانہ پڑھنے والا بھی اُن کی سی نظر پیدا کرسکے اور عیب بھی حُسن نظر آنے لگیں، اس لئے کہ عورت اور اُس کی فطرت معصوم ہے، وہ کسی گناہ یا بُرے فعل کی مرتکب نہیں ہو سکتی، ہماری نظروں میں جن چیزوں کو عیب سمجھتی ہیں وہ اُس کے لئے حُسن ہیں، وہ اُس کی دلفریبی میں اضافہ کرتی ہیں۔

یہاں تک کہ موجودہ افسانہ نگاروں کے جتنے مختلف گروہوں کی

اور مجنوں کے بعض افسانوں میں موجود ہیں۔ کچھ اسی طرح کے سحر آگیں مجسمے اُن افسانوں میں بھی ہیں جنھیں انگریزی جامہ اُتار کر ہندوستانی کپڑے پہنا دئے گئے ہیں۔ کپڑے تو برائے نام ہیں، عریانی ہی عریانی ہے۔ آنکھوں سے ممکن نہیں کہ دیر تک ان جادو بھری تصویروں کو دیکھیں اور اپنا ایمان محفوظ رکھ سکیں۔ فطرت نے بعض ایسی حسین چیزیں بھی پیدا کی ہیں جنھیں انسان اُن کی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ ممکن ہے کہ دیکھ سکے تو خود کو انسانیت کی حدود کے اندر رکھنا بھی اس کے لئے غیر ممکن ہو جائے۔ خدا محفوظ رکھے۔

ایک چوتھا گروہ اپنے نزدیک نہ صرف عورت کی ظاہری خوبیوں کو اُس کی دلکشی کا معیار سمجھتا ہے نہ اُس کے فطری اور روحانی محاسن کو وہ سے آنکھوں کا نور اور دل کا سُرور بنانا چاہتا ہے۔ وہ اُس سحر طراز مجسمۂ حُسن میں پھول کی نزاکت، چاند تاروں کی چمک اور عشوہ وناز کے ساتھ مشک اور عنبر کی خوشبوؤں کے پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک "حسن پری اس کا اِک جلوۂ مستانہ ہے" اور حوروں کی روحانیت اُس کی بلند منزلوں کا پہلا زینہ۔ حُسن کے اس مجسمے کو مادی صورت دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ تصویریں صرف خیال پیدا کر سکتا ہے۔ زبان اور قلم میں اتنی قدرت نہیں۔ اس لئے افسانہ نگار عموماً ان شکلوں کو مبہم طریقے سے بیان کر دیتا ہے، اور خود کو سماوی بلندیوں تک لے جا کر حُسن کے دوسرے پرستاروں کو

شاعروں نے زاہد فریب، توبہ شکن، صبر آزما اور رہزنِ تمکین و ہوش کی ترکیبیں تراشیں۔ یہی حسن ہے جس کے لئے کبھی شاعر کہتا ہے کہ ع

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ

اور کبھی کہہ اٹھتا ہے کہ ع دولت و عزت و ایمان ترے قدموں پہ نثار

یہی حسین سیمیں بدن ہے جس کے لئے بدن کارواں رواں اس طرح قصیدہ خواں ہے ؎

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

ان افسانہ نگاروں کے نزدیک عورت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ لوگ اس کے ظاہری حسن کو دیکھیں۔ اس کی اداؤں اور نازوں پر خود کو نثار کر دیں۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور وہ انھیں نہ مل سکے۔ وہ مل گئی تو دونوں جہان سے سیری ہو گئی۔ روحانی لذتیں مادہ پرستی پر قربان کر دی گئیں۔ ایسی عورتوں کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ان میں سیرت کی بھی وہ خوبیاں موجود ہوں جو صورت میں ہیں۔ وہ انگریزی پھولوں کا گلدستہ ہیں۔ دیکھیں تو نظریں پھسلیں۔ چھوئیں تو چھوڑتے نہ بنے۔ خوشبو کے ہونے نہ ہونے سے کوئی غرض نہیں۔ ایسی عورتوں کے دلفریب مجسمے نیاز

ان راجپوت عورتوں میں بھی بھلا یہ فطری خون کہاں تک موجود نہ ہوتا؟ ان میں مشرقی عورتوں کی ساری دلکشیاں تھیں۔ کسی شاعر کا اچھے سے اچھا شعر اُن کی طرف منسوب کیا جا سکتا تھا۔ اُن کے حسن کی دمک زہرہ ومشتری کو ماند کرتی تھی۔ باتوں میں پھول جھڑتے تھے۔ وہ محبت کی دیویاں تھیں۔ دوسری ہندوستانی عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے شوہر کو دیوتا مانتی تھیں لیکن ان سب باتوں کے ساتھ اُن کے بازوؤں میں وہ زور تھا جو بہادر راجپوتوں میں اور اُن کی تلواروں میں وہ سارے جوہر تھے جو اُن کی قوم کے کسی سورما کی تلوار میں مل سکتے تھے؛ لیکن اب ہمارے سامنے صرف اُن کی خیالی تصویریں ہیں۔ خیال آنکھوں کو اُن تک لے جاتا ہے اور دل ان دلفریب مرقعوں کو چلتے پھرتے پتلوں کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اُردو افسانہ نگاروں کا ایک تیسرا گروہ نہ عورت کی پہلی تصویر کو پسند کرتا ہے نہ دوسری کو۔ پہلی میں شعریت نہیں اور دوسری میں نسائیت مفقود ہے۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو یہ نغمہ خوش آئند ضرور ہے۔ اس قسم کے افسانہ نگاروں نے شعریت اور نسوانیت کی جو متحدہ تصویریں کھینچی ہیں اُن میں رومانیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ وہ صرف عورت کے ظاہری حُسن کو شعریت کہتے ہیں اور ہمارے سامنے اس ظاہری حُسن کے ایسے دلکش نمونے پیش کرتے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اسی قسم کا حُسن ہے جس کے لئے ہمارے

انھوں نے چاہا کہ عورت کو اُس کے حقوق واپس دے دیئے جائیں۔ اس استحقاق کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے عورتوں کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا۔ اُن میں سیرت کی جتنی اچھائیاں ممکن تھیں پیدا کیں۔ عورت کو ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کی دیوی بنا دیا۔ شوہر خواہ اُس پر کتنے ہی ظلم کرے اس کی فطرت کا صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیئے، اپنی نیند، عیش، آرام کو صرف اپنے سرتاجِ زندگی کے آرام پر بھینٹ چڑھا دے اور اُس کے آرام کو اپنا سکھ چین اور خدمت کو عبادت جانے۔ اس قسم کے نسوانی کردار ہمیں عموماً راشد الخیری، پریم چند اور سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ ایسی عورتوں کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی نسائیت ہے۔ وہ شرم و حیا کی پتلیاں ہیں۔ اُسے قائم رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن ہر بات میں اور ہر کام میں اُن کی فطری نسائیت غالب رہتی ہے۔

عورت کی اس سے زیادہ دلکش اور قابلِ پرستش تصویریں وہ ہیں جنھیں پریم چند نے اپنے بعض افسانوں میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ راجپوتوں کی عظمتیں اور اُن کے پُرشکوہ کارنامے اب تک ہمارے سامنے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی آن کے لئے جان اور مال سب قربان کر دیا، سب کچھ کھو بیٹھے مگر اپنی بات میں عزت سمجھی۔ سب گیا مگر بات نہ گئی۔

عورت کے متعلق یہ ایک ایسی رائے ہے جو دنیا والوں کو سُنانے کے لئے نہیں کہی گئی۔ البتہ جو ادبی تخلیقیں ہماری نظروں کے سامنے ہیں اُن سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دُنیا' عورت' کو کیا سمجھتی ہے۔

ہماری شاعری میں عورت کی فطرت بے حد دلچسپ طریقوں سے ہمارے سامنے لائی گئی ہے۔ لیکن ہمارے مختصر افسانوں میں اس رومانی مخلوق کی جیسی جیسی تصویریں ہیں وہ اگر ایک طرف انسان کو صرف اُسی کا بنا سکتی ہیں تو دوسری طرف اُن میں یہ اثر بھی موجود ہے کہ انسان بجائے اُس سے مانوس ہونے کے اُس سے دور بھاگے۔

عورت کی سب سے پہلی اور بعض کے نزدیک بالکل غیر شاعرانہ تصویر اُن افسانوں میں ہے جو سماجی، معاشرتی یا اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اُردو میں جب مختصر افسانہ نویسی کی ابتدا ہوئی تو قوم اور مُلک انحطاط اور تنزّل کی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ نہ سماجوں کی حالت ٹھیک تھی نہ گھروں کی۔ ہر طرف نفسی نفسی تھی۔ ایک شخص دوسرے کے حقوق پر قبضہ کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ کمزور خاموشی سے ان ظلموں کو برداشت کر رہے تھے۔ عورت کو فطرت نے کمزور پیدا کیا ہے۔ کچھ تو اُس کے حقوق اُس سے پہلے ہی چھین لئے گئے تھے، زمانے کی گردشوں نے اب اُس سے سب کچھ چھین لیا۔ مصلح سب سے پہلے اسی طرف متوجہ ہوئے۔

پانچواں باب

عورت کا تخیّل

عورتیں اپنے کو جو کچھ سمجھتی ہیں اُس کا اظہار زبان سے ہونا ممکن نہیں البتہ دل اُسے محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن مردوں نے اب تک عورت کو جو کچھ سمجھا ہے اُس کا مطالعہ بھی اتنا ہی دلکش اور دلفریب ہے جتنی خود عورت۔ میرے ایک دوست جو فطرتاً شاعر ہیں جب یہ سُنتے سُنتے تھک گئے کہ عورت دُنیا میں سب کچھ ہے، اس میں کائنات کی ساری دلفریبیاں ایک ساتھ جمع کر دی گئی ہیں، تو ایک دن بولے کہ "بھئی مَیں آج تمھیں بتاؤں کہ مَیں عورت کو کیا سمجھتا ہوں"۔ مَیں نے پوچھا "کیا؟"، تو نہایت ملہمانہ انداز میں فرمایا کہ "خدا سب سے زیادہ حسین ہے۔ وہ مجسّم نور ہے اور مادیّت سے پاک۔ لیکن اگر اُسے دُنیا کے سامنے مجسّم ہو کر آنا پسند ہوتا تو عورت کے بھیس ہی میں دُنیا کے ہر شخص کو خوبصورت نظر آ سکتا تھا"۔

لطیف اشاروں سے واقف ہو سکیں۔ انگریزی والوں کے لئے ایک
مفید مشورہ یہ ہے کہ وہ فرانسیسی، روسی اور امریکن افسانوں کو
صرف فن کے نقطۂ نظر سے پڑھیں اور اُن سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد
افسانے لکھیں جن میں فن بدرجۂ اتم موجود ہو۔ یہی اُردو کی بڑی خدمت
ہے ورنہ اندھے بن کر ترجمہ کرنا اور اُردو میں کثرت سے ان کی بھرمار،
اُردو کے طبع زاد افسانوں کی خصوصیتوں کو بھی مٹا کر رکھ دے گی اور
اُردو میں اب تک جو کچھ ہے وہ بھی فنا ہو کر رہ جائے گا۔
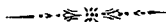
لی ہے۔ ان کے افسانوں پر بھی یہ اثر بے حد گہرا ہے۔ سجاد حیدر نے
اُردو میں اس روش کو کافی بلندی کے ساتھ رائج کر دیا ہے۔ دوسرے
افسانہ نگاروں کو بھی چاہیئے کہ وہ ان خزانوں کو اُردو میں منتقل کریں۔ لیکن
ایرانی، ترکی، روسی، فرانسیسی، انگریزی اور امریکن افسانوں
کے علاوہ جو چیز اُردو میں بے حد پسندیدہ سمجھی جائے گی وہ بنگالی
افسانوں کے ترجمے ہیں۔ ہمارے بعض افسانہ نگار اس طرف متوجہ
ہیں اور قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے
حامد علی خاں کی خدمات بے حد قابلِ قدر ہیں۔ بنگالی ادب، فن اور اس کی
لطافتوں کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ اس لئے اس کے جتنے زیادہ ترجمے
اُردو میں ہوں گے زیادہ اچھا ہے۔ ترجمہ کرنے والے افسانہ نگاروں
کی ان محمود کوششوں کو سراہنا چاہیئے لیکن میرے نزدیک اُردو کی
بڑی خدمت یہ ہو گی کہ ہمارے افسانہ نگار دوسری زبانوں کے صرف
ایسے افسانوں کے ترجمے اُردو میں کریں جو فن کی حیثیت سے بے حد
مکمل ہیں۔ اُردو کے افسانوں میں اور تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن
اکثر اوقات جو کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے وہ یہی فنی
کمی ہے۔ اُردو میں جتنے ترجمے ہوں اُن میں سے زیادہ میں فن کا
احساس زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ مبتدی ان افسانوں کو پڑھ کر فن کے

وہی رقص، وہی پھول، وہی بوٹے۔ سادگیوں میں رنگینیاں اور رنگینیوں میں سادگیاں لیکن اب دُنیا نرالی ہوگئی اگر دوسری قوم والا ان ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کو دیکھے تو ہماری صحیح فطرتوں اور زندگیوں کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتا ہے۔

اُردو میں فرانسیسی اور روسی افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کے ترجمے زیادہ کثرت سے ہو رہے ہیں۔ فرانسیسیوں میں موپساں اور روسیوں میں چیخوف، اُردو والوں کو اس قدر پسند آئے کہ وہ دوسرے افسانہ نگاروں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ موپساں اور چیخوف افسانہ نگاری کی دُنیا میں ایک بہت بلند مرتبے کے مالک ہیں اور فن کے لحاظ سے اِن کے افسانے دُنیا کے منتخب افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اُردو میں ترجمہ کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ روس اور فرانس کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرف بھی توجہ کریں اور اُن کے بہترین افسانوں کو اُردو میں منتقل کریں۔ فرانس اور روس کے علاوہ انگریزی افسانہ نگاروں میں فن کو لارنس اور جوائس نے جو ترقی دی ہے اُس لحاظ سے ان کے ترجمے بھی اُردو کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

ترکی ادبیات نے رومانی اور شاعرانہ حیثیتوں سے بے حد ترقی

اُن کے ذکر میں کچھ دلفریبی نہیں لیکن اس کا احساس ضروری ہے،
اس لئے سُنئے کہ سب سے پہلی چیز جو ان ترجموں نے ہم سے چھین لی،
ہماری جدّت ہے۔ ہمارے اچھے سے اچھے افسانہ نگار ترجمہ کرتے کرتے
اس کے اس قدر عادی ہو گئے کہ اپنی سوچنے کی طاقت کھو بیٹھے۔
سوچنے بیٹھے تو چیخوف اور ایرج کی تخئیلوں نے دماغ میں چکر لگانے
شروع کر دیئے۔ قلم لے کر بیٹھے تو ان کی فضا میں پلے ہوئے تشبیہ اور
استعارے سامنے آئے۔ لکھنا شروع کیا۔ تو ان کے جملوں کی ترکیبوں نے
لفظی شکلیں اختیار کر لیں۔ اب اس مرض کا علاج؟ کچھ نہیں۔ نتیجہ! اپنی
تخئیل مردہ، اپنے رنگیں تشبیہ اور استعارے تاریکی کے پردے میں، اپنی حسین
اور دلکش ترکیبیں غائب، ہمارے رنگ ماند، اُن کے رنگ شوخ، جامِ شرق
میں بادۂ مغرب، گلشنِ ہند میں نخلِ فرنگ۔ انصاف کیجئے کہ ان میں وہ
فطری دلکشی کہاں؟ آنکھوں نے اس میں دلکشی محسوس کرنی شروع
کر دی تو افسانہ نگاروں نے اپنی تخئیلوں کی طرف دھیان دینا بھی چھوڑ دیا۔

اس کا ایک دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانوی دنیا کی جان، ملکی ادب کی
روح، قومی دلکشی کا سرمایہ، مقامی رنگ، اس میں سے بالکل غائب
ہو گیا۔ اگر ترجمے نہ ہوتے تو افسانوں میں جو کچھ ہوتا اپنا ہوتا، اپنے خیالات،
اپنی باتیں، اپنی بزمیں، اپنے جام اور اُن میں اپنی شراب، وہی نغمے،

ی روشن اور تاریک فطرتیں ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔
فسانوں نے وہ کام کیا جو تاریخ نہیں کرسکتی تھی۔ تاریخ میں ہم صرف
اقعات کی تفصیلیں پڑھ سکتے ہیں، کشت و خون کے افسانوں کی یادیں
سے پڑھ کر تازہ ہوسکتی ہیں، ملک کی بہادری کے کارنامے ہمارے
لوں کو گرما سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن ہمارے دلوں اور ہماری
روحوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک
وسرے کی روزانہ زندگی کے واقعات اور فطرتوں سے واقف ہوں۔
ی آئینہ ہمارے دلوں میں باہمی ربط و ضبط اور محبت کی چمک پیدا
ر سکتا ہے۔ افسانوں میں تاریخ نہیں کشت و خون کے افسانے نہیں
بہادری کے مرقعے نہیں، اُن میں صرف ہماری مختصر اور سادی زندگی
کی تصویریں ہیں جو ہمارے دلوں پر محبت کے نقش جماتی ہیں۔ اس لئے
ن ترجموں کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ انھوں نے مختلف
موں کے درمیان ایک روحانی تعلق پیدا کر دیا۔

حسن کی تصویریں دلکش ہوتی ہیں لیکن ان کا حُسن اس وقت تک
یادہ دلفریب نہیں ہوتا جب تک انھیں عیوب کی روشنی میں نہ دیکھا جائے
ں میں کوئی شک نہیں کہ ان ترجموں نے ہم میں بہت سی خوبیاں پیدا
یں لیکن اُن نقصانوں کی تلافی بھی مشکل ہے جو ہمیں اُٹھانے پڑے۔

اُردو میں افسانوں کے انجام میں اس بات کا خیال ضروری تھا کہ ہیرو کا انجام طرب و انبساط ہو۔ وہ اپنی امیدوں میں کامرانی حاصل کرے۔ لیکن انگریزی ترجموں کے اثر نے یہ قید بھی ہٹادی، اور اب افسانے طرب کے علاوہ حُزن پر بھی ختم ہونے لگے۔ بلکہ کبھی کبھی اُن میں زیادہ ادبیت پیدا کرنے کے لئے انھیں تذبذب پر ختم کیا گیا۔ ظاہر بین نظریں اسے بُری نظر سے دیکھتی ہیں لیکن بلند مذاق کے نزدیک یہ چیز بے حد کیف آگیں ہے۔

انگریزی افسانوں کے علاوہ ہماری زبان میں جاپانی، ایرانی اور بنگالی افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے اور ان زبانوں اور قوموں سے بھی ہماری افسانہ نگاری نے بہت سے فائدے حاصل کئے۔ جاپان کی سادہ مگر پرکیف تخئیلیں، ایران کی شاعرانہ نزاکتیں اور بنگال کے سحر آگیں سرود اور نغمے ہماری زبان اور ادب کے خزانے میں بیش بہا جواہر کی طرح داخل ہو گئے۔ اور جہاں ہم ایک طرف مغرب کی حقیقت طرازیوں کا لطف لے رہے تھے وہاں مشرق کی سامعہ نواز اور روح افزا شعریت اور موسیقی نے ہماری دُنیا کو روحانی فضاؤں تک پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ ترجموں سے عام طور پر جو فائدہ ہمیں ہوا اُن میں سب سے بڑا یہ ہے کہ انگلستان، امریکا، روس، چین، جاپان اور ایران

، ایسا اور نفسیاتی حُسن یہ پیدا کیا کہ ہمارے افسانہ نگار کردار نگاری کو بھی اس کا ایک اہم جزو سمجھنے لگے۔ اب تک جو افسانہ نگاری ہوتی تھی اس میں حیاتِ انسانی کے صرف روشن پہلو دکھائے جاتے تھے۔ ہیرو کو افسانہ لکھنے سے پہلے جن صفات کے ساتھ منسوب کیا جاتا تھا وہ اس میں شروع سے آخر تک باقی رہتی تھیں، اور وہ بجائے ایک فطری انسان ہونے کے محاسن کا پتلا بن کر رہ جاتا تھا۔ افسانہ پڑھنے والے اس کمی کو وقیع نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ انگریزی افسانوں میں عموماً کردار نگاری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کردار فطرت کے بالکل مطابق ہوں، ان میں واقعات برابر انقلاب پیدا کرتے رہیں، غم اور خوشیاں رفتہ رفتہ کردار انسانی کو مختلف منزلوں سے لے کر گذریں، اس چیز کو انگریزی کی اصطلاح میں کردار کا ارتقا (Character in the Making) کہتے ہیں۔ اُردو کے افسانوں میں یہ حُسن بھی اب بدرجۂ اتم پیدا ہو گیا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ فطرت سے بہت قریب ہو گئے ہیں۔

نفسیات نے انگریزی افسانوں کے انجام میں ایک خاص بات پیدا کر دی تھی کہ وہ ہر طرح فطرت کے مطابق ہوتے تھے۔ واقعات کبھی اس طرح کے ہوتے ہیں کہ اُن کا انجام طرب ہو اور کبھی اس طرح کے کہ ان کا فطری انجام حُزن ہو، خواہ اس انجام کا نتیجہ ہیرو پر اچھا پڑے یا نہ پڑے۔

افسانہ نگار بھی اس ذہنیت سے بے حد متاثر ہوئے اور اس لئے ہمارے افسانوں کو بھی وہی وقیع اور بلند درجہ حاصل ہوگیا جو دوسری قوموں کے افسانوں کو تھا۔

اُردو کے افسانوں میں جو رجحانات اس وقت بہت زیادہ شدت کے ساتھ عمل کر رہے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سوسائٹی یا ہمارے افسانہ نگاروں نے عورت کو ایک ایسی شخصیت دے دی ہے جس پر سماج کے حُسن و قبح کا دار و مدار ہے۔ یورپ میں عورت کو سوسائٹی میں ایک بہت بلند اور دلکش مرتبہ حاصل ہے۔ وہاں کی کائنات کا ہر ذرّہ اسی دلفریب مخلوق کے حُسن کی چمک سے روشن ہے۔ اس لئے افسانہ نگاروں نے بھی اپنی داستانوں کی دلکشی بڑھانے کے لئے اُسے کسی نہ کسی پہلو سے اپنے افسانوں میں شامل کرلیا۔ اُردو میں ترجمہ کرنے والوں کو بھی اس حُسن نے بہت لبھایا اور اب جسے دیکھئے اسی دلفریب دام میں گرفتار ہے۔ جو ہے وہ عورت کے گُن گا رہا ہے۔ چونکہ فطرت نے عورت میں کچھ ایسی دلکشیاں پیدا کی ہیں جو انسان کو کہیں اور نہیں مل سکتیں اس لئے جو افسانے اُن کے ذکر کا مرکز تھے وہ بھی دلکش سمجھے گئے اور اُردو افسانہ نگاری کی دُنیا میں اس طرح ایک نئے حُسن کا اضافہ ہوا۔ افسانہ نگاری کی دُنیا میں ترجموں نے

یہ کہئے کہ اصل شکل کو کتنا ہی مسخ کرنا چاہیں اس کے کچھ نہ کچھ خط و خال ضرور باقی رہ جائیں گے۔ روح کی تبدیلی اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لئے سب سے پہلی چیز جو اُردو افسانوں کو روسی، فرانسیسی، انگریزی اور امریکن افسانوں سے حاصل ہوئی وہ اُن کی نفسیاتی ذہنیت تھی۔ چونکہ یورپ کی قوموں کا ذہنی عروج ہندوستان سے بہت پہلے ہو چکا تھا اس لئے ان کی گفتار، کردار، عمل اور علم ہر چیز میں ایک باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔ افسانے چونکہ انسانی زندگی کے صحیح مرقعے ہیں اور اُن میں فطری آب و رنگ کا بھرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک افسانہ نگار نفسیات کے ہر پہلو سے واقف نہ ہو اس لئے یورپ کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں باقاعدگی اور یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ہر قدم پر نفسیات سے کام لیا۔ ہر کردار، فعل اور گفتار کو پہلے نفسیات کی میزان پر تولا اور اُسے ہر طرح پرکھ کر کھوٹے کھرے کی تمیز کر کے اپنے کام میں لائے۔ اور اس لئے ان افسانوں میں جہاں دلچسپی اور کیف ہے وہاں حقیقت کی ایک دنیا بھی پوشیدہ ہے اور پڑھنے والا جو لطف اور سرور حاصل کرتا ہے وہ خود اپنی دنیا میں رہ کر۔ اُردو کے افسانوں میں اب تک یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ افسانہ نگار دلچسپی کو اپنا مقصد سمجھتے تھے اور اس کے پیچھے حقیقت کے عنصر کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے لیکن جب سے اُردو میں یورپ کی زبانوں سے ترجمے ہونے شروع ہو گئے اُردو کے

تصنیف و تالیف کا سلسلہ اسی فطری طریقہ پر شروع ہوا اور تھوڑے ہی دنوں میں فارسی کے ترجمے ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن ابتدائی دوروں کے بعد یہ سلسلہ کسی قدر کم ہو گیا اور لوگوں نے ترجمہ کی طرف سے اپنے خیالات کو ہٹا لیا۔ فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد اس روش میں پھر جان پڑ گئی اور ترجمے کثرت سے ہونے لگے۔ مغربیت نے جوں جوں اپنا اثر اور زیادہ کیا۔ ان ترجموں کی تعداد بڑھتی گئی۔ دہلی کالج کے قائم ہونے سے انگریزی تصنیفوں کے ترجموں کی بھی مستقل ابتدا ہو گئی۔ لیکن اب تک جتنے ترجمے ہوئے ان میں ادبیت برائے نام تھی۔ ادبی ترجمے بیسویں صدی کے شروع میں ہوئے۔ ان ترجموں میں زیادہ تعداد سائنس کے مختلف شعبوں کی کتابوں کی تھی۔ ذرا اور وقت گزرا تو افسانے نے اپنا اثر دلوں پر جمایا اور جہاں طبع زاد فسانے لکھے گئے وہاں دوسری طرف انگریزی مصنّفوں کی روحیں اردو کے قالب میں ڈھالی جانے لگیں۔

افسانوی دُنیا میں اس ادبی انقلاب سے ادب اور زبان کو بہت سے فائدے ہوئے۔ یہ فائدے دو قسم کے ہیں۔ پہلے وہ جن کا تعلق روح سے ہے، دوسرے وہ جنھیں جسم یا ڈھانچا کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اول خیال میں، دوسرے زبان میں۔

ترجمہ کرتے وقت ہم کتنی ہی کوشش کریں یا دوسرے لفظوں میں

ہر ادب کی ابتدا عموماً تالیفوں اور تصنیفوں سے ہوتی ہے جب یہ خزانہ ذرا بھر جاتا ہے تو مُلک کے ادیب کسی کشور کشا سلطان کی طرح اِدھر اُدھر نظر دوڑانی شروع کرتے ہیں کبھی اس مُلک کے خزانوں کو تاکا کبھی اس ملک کے جواہرات پر نظر دوڑائی، کبھی اِدھر لپکے کبھی اُدھر بھاگے۔ آخر ایک چیز کی طرف رجوع ہوگئے۔ کسی انقلابی رہنما نے ان حملوں میں کامیابی حاصل کی اور کوئی نہ کوئی ادبی جواہر پارہ مُٹھی میں دبا کر فخر کرتے ہوئے اپنے ملک میں واپس آگئے۔ قوم کی آنکھیں اس نئے حُسن کے دیکھنے کی عادی نہیں تھیں۔ جس نے دیکھا آنکھیں پھاڑ دیں، نہ مُنہ سے آہ نکلی نہ واہ۔ لانے والے کو بھی افسوس ہوا کہ اس کی کوششیں بیکار گئیں۔ آخر جدت نے کوئی نہ کوئی نئی راہ نکال لی۔ اور اس ادبی عروس کو اپنی قوم کا جامہ پہنایا۔ ظاہری حُسن و خوبی میں جو یہ نمایاں جلوہ رونما ہوا تو آنکھوں نے اس سحر کی لذتیں محسوس کرنی شروع کیں اور دل نے تحسین کی نذر اُس کے قدموں پر بھینٹ چڑھائی۔ اس انقلابی ابتدا کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے شوخ مزاج ادیبوں نے بھی اس کا اتباع کرنا شروع کیا اور ادب اس نئی ادبی فضا کے جلووں سے جگمگانے لگا۔ یہ ہوئیں ترجمہ کی کارفرمائیاں۔

اب ہماری زبان کی داستان سُنئے۔ اُردو میں بھی شروع میں

چوتھا باب

ترجمے

ترجمہ بھی کس قدر دلچسپ چیز ہے! چیزوں کو گھر سے بے گھر کرنا، ولایت کی چیزوں کو لاکر ہندوستان میں پھینک دینا، بنگال کی آزاد فضاؤں کو پنجاب کی سرزمینوں میں قید کرنا، روشنیوں کو تاریکی کی طرف لے جانا، خیالات کو اس بزم سے اس بزم میں لاکر بٹھا دینا، نظامِ تخیل کو درہم برہم کر دینا، دوسروں کی ادبی بلندیوں کو اپنا بنا لینا، غرض اسی اُلٹ پھیر کا نام لوگوں نے ترجمہ رکھ لیا ہے۔

ترجمہ سے کب اور کس وقت کام لیا جاتا ہے؟ کیوں اس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور اس کی طرف رجوع کرنے سے کون کون سے فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں؟ ان چیزوں کے جاننے کی کوشش خود ترجمہ کی حقیقت سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ سُنئے۔

اس لئے دلچسپی تلاش کرنے والے دلِ دیوانہ کے لئے نشاط و طرب کے سامان ضرور ہیں۔ اور اسے بلند مقصد نہ سمجھنا افسانہ نگار پر بڑا ستم ہے سجاد حیدر، نیازی اور مجنوں کے افسانوں میں اگر کوئی اور اصلاحی مقصد نہیں تو نہ ہو لیکن کم از کم وہ ہمارے دلوں کو دُنیا کے تمام لطیف اور کیف آور عناصر سے آشنا تو ضرور کرتے ہیں۔ ہم میں زندگی کا ولولہ اور نشاط کی روح تو پھونکتے ہیں۔ ہمیں بے نیازِ غم تو بنا دیتے ہیں۔ اب اگر اسے بلند مقصد نہ کہا جائے تو مجبوری ہے۔

بلند اصلاحی مقصد ہے۔

عظیم بیگ کے افسانے پڑھ کر جس چیز کا احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انھیں انسان کی مختلف کمزوریاں معلوم ہیں اور وہ ان چیزوں پر افسانے میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ میٹھی میٹھی چٹکیاں بھی کبھی کبھی اصلاحی مقصد کو بے حد نمایاں کر دیتی ہیں۔

حامد علی خاں کے افسانے گو زیادہ تر ترجمے ہیں لیکن اُن پر حزنیہ انداز اس طرح چھایا ہوا ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو اس رنگ میں ڈبونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہ غیر محسوس ہے۔ حامد علی خاں نے حزن جان بوجھ کر نہیں پیدا کیا۔ اُن کی فطرت نے مجبور کیا کہ وہ ایسے درد بھرے افسانوں کے ترجمے کریں۔ اب انھیں پڑھ کر کوئی شخص ایک ہی سا نتیجہ مرتب کرے، ایک ہی طرح متاثر ہو، ایک ہی احساس میں ڈوبے، تو اس میں افسانوی مقصد کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے؟

مختصر یہ کہ ہمارے افسانوں میں سے کسی بڑے اور مشہور افسانہ نگار کے افسانے ایسے نہیں جو کسی نہ کسی بلند مقصد سے خالی ہوں۔ اگر اُن میں کوئی اور مقصد نہیں تو کم از کم جذبات رومانی کی پرورش کا سامان، عشق اور محبت کے جذبات کے اُبھار کے لطیف اشارے

ان مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانے کا پلاٹ بنایا، اور اس پلاٹ کو فن اور افسانوی دلکشی کا پابند بنا کر اس طرح پیش کیا کہ پڑھنے والے کے دل پر اس کا زیادہ سے زیادہ اثر پڑا، اور وہ کہنے لگا کہ سدرشن کے افسانے ایک بلند مقصد سے لکھے گئے ہیں۔

حامد اللہ افسر کے افسانوں میں ہندوستان کی ذہنی پستی کا جھینکنا ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ کوئی واعظ منبر پر کھڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے ہندوستان کے باشندو! تم میں پستی کا یہ احساس مہلک حد تک پہنچ گیا ہے تم چونکو! اور اپنے اس مرض کا علاج کرو! ۔ یہ طریقہ افسانے کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ افسانہ نگار صرف ان ذہنی پستیوں کے چند نقوش کو اس طرح افسانہ کا جامہ پہناتا ہے کہ پڑھنے والے اس جذبہ کو شدت کے ساتھ محسوس کریں، ان کا محسوس کرنا ہی صالح مقصد کی تکمیل ہے ۔

حسینی کے افسانوں میں جو جذبہ باوجود افسانوی دلکشی اور فنی بلندی کے بے حد نمایاں ہے وہ درد اور تڑپ ہے۔ وہ واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا غیر ممکن ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد ایک تڑپ اور درد کی کسک نہ محسوس کرے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ سے لوگوں میں دردمندی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ایک

اس قدر نمایاں کر دینا کہ افسانوی اور فنی نزاکتوں کا خیال تک نہ رہے بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔ ایسی صورت میں نہ اصلاحی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے اور نہ افسانہ کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ اس لئے افسانہ نگاروں کو چاہیئے کہ وہ اس مقصد کو ہمیشہ فن کا تابع رکھیں۔

اپنے افسانہ نگاروں میں سے پریم چند کو لیجئے۔ وہ ہماری مردہ ذہنیتوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو راجپوتوں کے افسانے اور اُن کے مثالی کردار ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دیہات کی زندگی اور اس کی خرابیوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو معمولی سے معمولی بات کو نفسیات اور افسانہ کے فن کا تابع بنا کر ہم تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے دل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سدرشن ہندوستان کی رسموں اور یہاں کے گھروں کے اکثر طریقوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اُنھیں کم سنی کی شادیوں، غریبوں کے گھروں کے بیاہ، تقلید کے سودے، خود غرضی کے جنون، فضول خرچی کے مہلک نتائج، قرض اور بے راہ روی کی مصیبتوں، بیوی بچوں اور احباب کی حق تلفیوں کے تجربے آئے دن ہوتے نظر آئے۔ اُن کے مشاہدے نے ان چیزوں کا نقش اُن کے دل پر بٹھا دیا۔ اُن کے حساس دل میں ان چیزوں نے ہیجان پیدا کیا تو اُنھوں نے زندگی کے

اُنھیں دور کرنا چاہتی ہے، وہاں اُس کا مقصد ہم میں جمالیاتی حس کا پیدا کرنا بھی ہے۔ وہ ہم میں محبت، ایثار، قربانی، دردمندی اور روحانیت کی روح پیدا کرنا چاہتی ہے۔ غرض اصلاح شاعرانہ، فلسفیانہ اور جمالیاتی احساسات کی بیداری کے لئے بھی کام میں لائی جاتی ہے اس لئے اگر اس کا مقصد اس قدر بلند ہو سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے اور افسانہ کو جدا کرنے کی کوشش کریں۔

یہ سب کہنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ اصلاحی مقصد ادب اور اُس کے ہر شعبہ کے لئے فطری سی چیز ہے۔ وہ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ فن کی دوسری پابندیوں کے ساتھ وابستہ ہے اور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں کہیں اُس کے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا جہاں اصلاحی مقصد کو افسانہ کی روح سمجھ کر اُسے شروع کیا جاتا ہے وہاں افسانے میں فنی اور افسانوی دلکشیاں بالکل باقی نہیں رہتیں۔ مثال کے لئے سلطان حیدر جوشؔ اور مولانا راشد الخیری کے افسانوں کو دیکھیئے۔ سلطان حیدر کے افسانوں[1] کے لکھنے کا مقصد صرف مغرب پرستی کی اصلاح تھے اور راشد الخیری کا مقصد عورتوں کے حقوق کی نگہبانی۔ مقصد دونوں اپنی اپنی جگہ بے حد بلند ہیں لیکن افسانہ میں اُن کا

---

[1] فسانۂ جوش والے افسانے۔

ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور یہ واقعات اگر کوئی اصلاحی پہلو پیش کرتے ہیں تو وہ اُنھیں کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے، اور لوگ کہنے لگتے ہیں کہ فلاں افسانہ نگار کا اصلاحی مقصد یہ ہے اور فلاں کا یہ، ورنہ حقیقت میں یہ اصلاحی مقصد خود ہماری زندگی کے واقعات اور افسانہ نگار کی مخصوص ذہنیت اور فطرت کا ایک جیتا جاگتا اور حقیقی مرقع ہے، جسے نہ افسانہ نگار اپنی ذات سے الگ کر سکتا ہے اور نہ ہم میں قدرت ہے کہ اُسے بدل سکیں۔

اصلاحی مقصد کو افسانوں کے لئے ایک غیر شاعرانہ چیز سمجھنے کی بِنا ایک اور غلط فہمی پر بھی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اصلاح یا اصلاحی مقصد کا تعلق محض ہماری مادّی زندگی اور اُس کے لوازم سے ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہم میں جو کچھ بُرائیاں ہیں، ہماری وہ فطرت جو ہم سے گناہ کرواتی ہے، یہی چیزیں ہیں جن کی اصلاح افسانہ نگار کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ اصلاح کا مقصد جہاں جسمانی ہے وہاں اُس سے زیادہ روحانی، جہاں وہ ہمارے اعمال پر نکتہ چینی کرتی ہے وہاں ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات کی آشفتگی اور اُن کی غیر روحانی روش کو بھی دور کرنا چاہتی ہے۔ وہ جہاں ہماری زندگی کے بعض مادّی پہلوؤں کو عیب سمجھ کر

جواب تو دے دیا گیا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر افسانہ نگار اصلاحی مقصد کو ذہن میں نہیں رکھتے تو مخصوص افسانہ نگاروں کے افسانوں میں مخصوص اصلاحی مقاصد کیوں ہوتے ہیں؟ ہر بڑے افسانہ نگار کے افسانے کسی نہ کسی علیحدہ مقصد یا پیغام کے ترجمان اور حامل ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مختلف انسانوں کی فطرتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے انھیں مختلف قسم کے واقعات پسند ہوتے ہیں اور ان کا اثر بھی اسی لئے مختلف ہوتا ہے لیکن اس کی دوسری اور حقیقت میں فنی وجہ یہ ہے کہ افسانہ کے لئے واقعاتی وفاشعاری بہت ضروری اور اہم چیز ہے۔ افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ جن واقعات کا بیان کرے، اور جس سوسائٹی کی ذہنیتوں کے مرقعے اپنے افسانوں میں پیش کرے۔ اُس سے بہت اچھی طرح واقف ہو، اس زندگی کے باریک سے باریک اور معمولی سے معمولی پہلو پر اُسے عبور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار اپنی ذہنیت اور پسند کے مطابق کوئی مخصوص سوسائٹی اپنے افسانوں کے پلاٹ کے لئے الگ کر لیتے ہیں اور اس کے اُن پہلوؤں کو افسانوں میں پیش کرتے ہیں جنھیں اوّل تو اُن کی فطرت اور جذبات سے بہت ہم آہنگی ہے اور دوسرے اُن پر اُنھیں اچھی طرح عبور بھی ہے، اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں اسی رنگ میں

کچھ اس طرح کا تھا کہ اُنھوں نے ہمارے دل پر اثر کیا اور ہماری فطرت اس فطری انجام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ افسانہ نگار نے جو مخصوص واقعہ افسانے میں پیش کیا ہے اگر اُس سے ہم پر ایسا اثر پڑا جس کی بنا پر ہمیں اپنی زندگی کے بالکل ویسے ہی واقعات یاد آسکے اور ان واقعات سے متاثر ہوکر ہمارے دل میں ذرا سی دیر کو بھی ان کے بُرے پہلوؤں کا احساس ہوا تو سمجھ لینا چاہئیے کہ افسانے میں اصلاحی مقصد نمایاں ہے اس لئے کہ افسانوں میں بلند سے بلند مقصد کا اظہار ہونے کے باوجود بھی ہم صرف اُس سے متاثر ہوتے ہیں، اُس پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہو جاتے۔ افسانہ تو افسانہ خود زندگی کے واقعات ہم میں صرف عبرت کا جذبہ ہی پیدا کر سکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ اس لئے اگر افسانہ کے واقعات سے ہم متاثر بھی ہوگئے، ہمارے جذبات و احساسات پر اُن کا اثر تھوڑی بہت دیر بھی قائم رہا، ہم نے اُنھیں قریب قریب بالکل اُسی طرح محسوس کیا جیسے کسی حقیقی واقعہ کو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس افسانہ میں اصلاحی مقصد کی کمی سمجھیں۔ اب خواہ یہ مقصد افسانہ نگار نے جان بوجھ کر پیدا کیا ہو یا خود بخود پیدا ہو گیا ہو، اس سے ہمیں بحث نہیں۔

اصلاحی مقصد افسانے میں خود بخود کیونکر پیدا ہو سکتا ہے، اس کا

ایسا نہیں جس کے یہاں ہمیں کوئی نہ کوئی بلند مقصد یا پیغام نظر آتا ہو
لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اصلاحی مقصد افسانہ نگار
ارادتاً اپنے افسانوں میں پیدا کرتا ہے؟ کیا وہ افسانہ لکھنے سے پہلے
یہ سوچ لیتا ہے کہ میں افسانہ صرف کسی اصلاحی مقصد سے لکھ رہا ہوں؟
اس سوال کا جواب دیتے وقت لوگوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے
ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہاں افسانوں میں اصلاحی مقصد شامل
کرنے والے افسانہ نگار لکھنے سے پہلے اُس کے متعلق سوچ لیتے ہیں۔
کچھ کہتے ہیں کہ نہیں، اصلاحی مقصد خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری رائے
اس کے متعلق یہ ہے کہ افسانوں میں اصلاحی مقصد کی تلقین کرنے،
اُنھیں کسی بلند پیغام کا حامل بنانے یا اُن سے اصلاح کا
بلند مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنے ذہن میں
کوئی مقصد لے کر افسانہ لکھنا شروع کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری
زندگی کا ہر واقعہ بجائے خود ایک اصلاحی پہلو پیش کرتا ہے، اور ہم دُنیا
کے بہت سے واقعات کو دیکھ کر اُن سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔
اُن سے سبق لے کر اپنی بُری باتوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ یہ واقعات
اس لئے نہیں ہوئے تھے کہ ہم اُن سے کوئی عبرت حاصل کرتے یا
اُن سے سبق لے کر اپنی بُرائیوں سے توبہ کر لیتے۔ لیکن ان کا اندازہ

لیکن فنون اور اُن کی بلند تخلیقیں، ادب اور شاعری کے بلند نمونے، مصوّری اور نقاشی کے تصوّر زا مرقعے اور افسانوی ادب کی لطیف داستانیں خود اس فرعون کے لئے موسیٰ بن جاتی ہیں، وہ بلند سے بلند فنّی تخلیق پر نظر ڈالتا ہے، اُس کا غائر مطالعہ کرتا ہے اور اُس کے اثرات کو اپنے دل کے گوشوں میں جگہ دیتا ہے تو جو چیز اُس پر سب سے پہلے اثر کرتی ہے وہ کوئی نہ کوئی بلند اصلاحی مقصد ہے۔ یہ چیز ادب اور اُس کے ہر شعبہ میں اس قدر اہمیت حاصل کر چکی ہے کہ کوئی ادبی کارنامہ، کوئی شاعرانہ سحر آفرینیوں سے ملا ہوا کلام رنگین، کوئی افسانہ یا کوئی ناول، اُس وقت تک بڑا نہیں سمجھا جاتا جب تک اُس میں کوئی پیغام نہ ہو یا جب تک وہ کسی نہ کسی طرح ہماری اصلاح پر آمادہ نہ ہو۔ اس لئے اصلاحی مقصد اور ادب کی بلندی اب قریب قریب مرادف کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود بھی ہمیں کچھ معیار مقرر کرنے پڑیں گے اور بغیر اُن کے ہم آسانی سے اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اصلاحی مقصد ادب اور فن کے لئے کس صورت میں حُسن ہے اور کس صورت میں ایک عیب۔

ہماری افسانہ نگاری کے عام رجحانات میں سے ایک نمایاں رجحان اُس کا اصلاحی مقصد ہے۔ بڑے افسانہ نگاروں میں سے کوئی

تیسرا باب

اصلاحی مقصد

اصلاحی مقصد اور فنون لطیفہ کے ہر شعبہ کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ ان دونوں میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا بعض لوگوں کے نزدیک فنی گناہ ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جس لطیف فن کی تخلیق کسی اصلاحی مقصد کے ماتحت ہوگی اُس میں اعلیٰ فنی لطافتوں کا پیدا ہونا محال ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے، اس لئے یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد وہ آسانی سے یہ کہدیتے ہیں کہ فنون لطیفہ اور اُس کی تمام شاخوں یعنی ادب، شاعری، افسانہ، مصوّری اور موسیقی کسی چیز میں اصلاحی مقصد کو شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ اس رائے کو ہر شخص ماننے کو تیار ہو جاتا ہے اور اس کی صداقت کو اپنا فنی ایمان جاننے لگتا ہے اور ہمیشہ کے لئے عہد کر لیتا ہے کہ اب ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کا دشمن سمجھے گا،

اس کے علاوہ مقامی رنگ کی ایک قابل قدر جھلک ایسے افسانوں میں بے حد نمایاں ہے جہاں افسانہ نگار نے کسی مخصوص طبقہ یا گروہ کی زندگی کی مصوّری کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ ہندوستانیوں کے عام ذہنی رجحانات کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ کس طرح ہندوستانی اپنے ذہنی اور ارادی خیالات اور رجحانات میں دوسرے ملکوں اور قوموں سے الگ اور ممتاز ہیں؟ یہ ایک دلچسپ اور قابل قدر مطالعہ ہے اور مقامی رنگ کا ایک بلند مظاہرہ۔ ایسے افسانے ہمیں اخترؔ کے یہاں زیادہ ملیں گے۔

کچھ دنوں سے افسانہ نگاروں کے سیاسی فضاؤں سے متاثر ہونے کے بعد ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جن میں موجودہ دور کے سیاسی اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ آزادی کی موجودہ جنگ، اُس کی دقتیں، اُس کے حاصل کرنے میں جن مصیبتوں کا سامنا ہے اُن کا احساس، یہ سب چیزیں مقامی رنگ کی اچھی مظہر ہیں اور اس لیے افسانہ نگاروں نے انھیں بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ایسے افسانوں کی طرف ہمارے بعض مزاحیہ نگار افسانہ نگاروں کے علاوہ اعظم کریوی زیادہ متوجہ معلوم ہوتے ہیں۔

اُن کی زندگیاں کس طرح گذرتی ہیں، اُن کی دماغی اور روحانی پریشانیاں
اُن سے کیا کیا کرواتی ہیں، اُن کے اضطرابات و ہیجانات کی مختلف
کیفیتوں سے اُن کی زندگی میں کتنے تغیّر و انقلابات پیدا ہوتے ہیں،
اُن کی بیوی اور اُن کے بچے اس زندگی میں کیا حصّہ لیتے ہیں، ان کے
دوستوں کو اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے، ان سب کے آپس کے
تعلقات کس کس طرح بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں اور اس کے باوجود انھیں
مجبوراً اپنی زندگیاں گذارنی پڑتی ہیں۔ یوں تو سدرشن کے افسانوں
میں کھینچے ہوئے یہ حقیقت آگیں مرقعے شہر کے ہندو اور مسلمان دونوں
گھروں کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ سدرشن ہندو گھرانوں
سے زیادہ واقف ہیں اس لئے اُنھیں اُن کی تفصیلات اور جزئیات پر زیادہ
عبور ہے اور وہ ان مراحل زندگی کو اس ماحول میں زیادہ کامیابی سے
پیش کر سکتے ہیں۔

اس کی رہی سہی کمی فضل حق قریشی اور راشد الخیری کے افسانوں
میں پوری ہوتی ہے، جنھیں پڑھ کر ہمارے سامنے مسلمانوں کے اوسط
گھروں کی تصویریں، اُن کے باہمی تعلقات، اُن کی گھریلو باتیں،
اُن کی ذہنیتیں، اُن کے رسم و رواج، اُن کے مذہب اور اس قسم
کی دوسری معمولی چیزوں سے ہم اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔

دیہات کی زندگی کا ایک نقش جسے کم افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کی زینت بنایا ہے، وہاں کے مخصوص مناظر فطرت، موسم، رت، کھیت - سبزے، ندی اور نالے ہیں، جہاں آزاد فضا کے سوا کچھ نہیں - ان موقعوں میں جو دلکشیاں ہیں اُن کا تعلق براہ راست شاعری سے ہے اور ہمارے اکثر افسانوں میں دیہاتی زندگی کا یہ پہلو بھی کافی نظر آتا ہے۔

دیہات کی زندگی کے علاوہ اگر ہم خود اپنے شہروں کی زندگی کو دیکھیں اور ان میں سے اُن معمولی معمولی باتوں کا جو ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتی ہیں اندازہ کریں تو مشاہدہ کے لئے ایک بہت وسیع موضوع ہاتھ آجائے۔ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے شہر کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھا اور وفاشعاری (Fedility) کے جذبہ سے کام لے کر ان میں سے اکثر باتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اُن میں مقامی رنگ کی یہ خصوصیت پیدا کی۔ سدرشن کے افسانوں کو پڑھئے تو اندازہ ہوجائے گا کہ اُنھوں نے شہر کے ہندوؤں کے اوسط درجہ کے گھروں کا عمیق نظروں سے مطالعہ کیا ہے - جو لوگ شہر میں ملازمتیں کرتے ہیں، دفتروں میں جاتے ہیں، اور دن بھر کی محنت کے بعد مہینہ بھر میں ایک مقرّرہ رقم پاتے ہیں۔

پریم چند کے علاوہ اور افسانہ نگاروں نے دیہات کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو اُس سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں کی عام روزانہ یا گھریلو زندگی کو زندگی اور حیات کی حقیقتوں سے الگ کر کے دکھایا گیا ہے اور ان میں دیہات کے مردوں اور عورتوں کی فطرتیں، اُن کی سادگی، اُن کا بھولا پن، اُن کا خلوص، اُن کا ایثار، اُن کی جانفشانی، اور بے فکریاں جن میں سیاست اور اقتصادیات کی گتھیوں نے پیچ نہیں ڈالے ہیں، بہشت کا نمونہ نظر آتی ہیں جہاں نہ فیشن کا گذر ہے نہ تعلیم کا اور نہ علم اور سائنس کا۔ اگر کچھ ہے تو صرف مذہب لیکن اُس کی شان بھی یہ ہے کہ اُس کے فلسفہ سے کسی کو غرض نہیں، اُس کے حقائق پر نکتہ چینی کرنے کا کسی کو خیال نہیں۔ سیدھی سادی باتوں پر عمل کیا جاتا ہے جو بجائے زندگی میں دشواریاں پیدا کرنے کے اُس میں ایک خوشنما تبدیلی کا سامان مہیا کر دیتی ہیں، جن سے روح اور جسم کی گندگیاں دُھل جاتی ہیں۔ اس قسم کی زندگی کے نمونے اعظم کے یہاں زیادہ اور حسینی نیاز مجنوں اور سدرشن کے یہاں کم ہیں، جنھیں پڑھ کر ہم خود اس زندگی کے فریفتہ و شیدائی بن جاتے ہیں اور اپنی زندگیوں سے اُن کا مقابلہ کر کے ان میں بہشت سامانیاں محسوس کرتے ہیں۔

کی فضائیں تنگ و تاریک اور بھیانک ہیں، جو اُن کی زندگیوں کو ان آزادیوں میں، ان سادگیوں میں، اِن بہاروں میں بھی دوزخ سے بدتر بنائے ہوئے ہیں۔ کسان اپنے گرد و پیش کے انسانوں کے ہاتھوں جو ظاہر میں بالکل اُن جیسے ہیں، لیکن دنیا نے انھیں کسان کی معصوم فطرت کا حاکم بنا دیا ہے، کتنا پریشان ہے۔ اُس سے زیادہ خود فطرت اُس کی مصیبتوں میں نت نئے غموں کا اضافہ کرتی رہتی ہے۔ کبھی پالا، کبھی گرمی اور لو، کبھی بارش کی کمی اور اُس کی کثرت، کبھی بجلی اور کبھی آندھیاں اُس کی زندگی کے سرمایہ کو، اُس کے سامان حیات کو، منٹوں میں برباد کر کے رکھ دیتی ہیں اور وہ صبر و شکر کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ کبھی اُسے دنیا میں اپنے نہ کئے ہوئے گناہوں کی سخت سے سخت سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں اور کبھی مجبور ہو کر ایسے گناہوں کا مرتکب ہونا پڑتا ہے جن کے لئے عاقبت میں سخت سے سخت عذاب مقرر ہیں۔ غرض اس کی زندگی کے تلخ حقائق اور اُن کے اُس سے زیادہ تلخ نتائج کا احساس ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے کیا اور اس زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا کر اُس میں ایک بڑی دلکشی پیدا کی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں پریم چند سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ کہیں کہیں اعظم نے بھی اِن باتوں کو اپنے پلاٹ کے لئے استعمال کیا ہے۔

کے افسانوں سے ہوئی جنھوں نے اصلاحی مقصد سے اِن چیزوں کے
بُرے پہلو ہمارے سامنے پیش کئے - اب تو آئے دن اس طرح کے پچاسوں
افسانے شائع ہوتے ہیں جن میں پلاٹ، ترتیب، ماحول، کردار اور
اُن کی ذہنیت، ہر چیز مغرب کے گہرے اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔
لیکن حقیقت میں اس تاریخی اثر کے سلسلہ میں اگر کوئی چیز ہندوستان
کے مقامی رنگ کی گہری نمائندگی کرتی ہے تو وہ صرف راجپوتوں کی
زندگی ہے جس سے پریم چند کے علاوہ کہیں کہیں حسینی نے بھی مدد لی ہے۔
مگر اس سے کہیں زیادہ جو چیز افسانوں میں مقامی رنگ اور اُس کے
بلند محاسن کا اضافہ کر رہی ہے وہ یہاں کے دیہاتوں کی زندگی ہے۔
ہندوستان کے دیہاتوں کی زندگی کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن سے
ہم میں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ہم نے وہاں کی زندگی کو صرف
سادگی اور کیف آور بہاروں کا مجموعہ سمجھ رکھا ہے، جہاں انسان ایک
آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہے، جہاں وہ فطرت اور اُس کے
مظاہر سے بہت زیادہ قریب ہے، جہاں قدرت کے حقیقی کرشمے اور
اُن کے لطف آگیں مرقعے زیادہ روشن نظر آتے ہیں۔ مگر یہ بہت کم
لوگوں کو معلوم ہے کہ دیہاتیوں کی زندگی کن مختلف کشمکشوں کے جال میں
پھنسی ہوئی ہے۔ اُن کی بسیط فضا آزاد ہے لیکن اُن کے بالکل قریب

میں ایک ایسا حرف روشن ہے جو تاریخ کے ساتھ چمکتا رہے گا۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے بعض نے راجپوتوں کی زندگی کے ان پہلوؤں کو افسانے میں نمایاں کر کے مقامی رنگ کی یہ گہری خصوصیت ان میں شامل کی ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں پریم چند سب میں پیش پیش ہیں۔

راجپوتوں کے علاوہ باہر سے آنے والوں میں جن لوگوں نے ہندوستان میں آ کر اسے اسی محبت کی نظروں سے دیکھا جیسے خود اپنے وطن کو وہ مغل ہیں۔ انھوں نے یہاں اتنے برسوں تک حکومت کی کہ ان کی زندگی کے تمام پہلو ہندوستان کی مقامی خصوصیات میں شامل ہو گئے۔ ان کا ذکر بھی افسانوں میں دلچسپی سے خالی نہ ہوتا، اس لئے حسن نظامی نے ان کے عہد کے اکثر واقعات کو افسانہ کی شکل میں لکھا ہے۔ اسی تاریخی انقلاب کے سلسلہ میں جو چیز ہماری تہذیب اور تمدن پر بہت گہرا اثر جمائے ہوئے ہے اور جس نے ہماری زندگی کے قریب قریب ہر شعبہ کو چھا رکھا ہے وہ مغرب کا اثر ہے۔ یہ اثر اب اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ اسے مقامی رنگ کی تحت میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس اثر کی نشانیاں ایک نہیں ہزاروں افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کی ابتدا اصل میں سلطان حیدر جوش

میں افسانہ نگار نے عالمگیر نقطۂ نظر سے کام لیا ہے وہاں یہ مقامی رنگ
کے مرقعے بے حد بلند چیزیں گئے ہیں اور ہمارے افسانوں میں فنی بلندی
اور افسانوی دلکشی کے علاوہ حقیقت اور فطرت حد درجہ شامل ہو گئی ہے
ہندوستان کے لئے یہاں کی تاریخ، اُس کے وقتی انقلابات اور
نئی نئی سیاسی اور مقامی تبدیلیاں عجیب دلچسپ چیزیں ہیں۔ ہندوستان
کی طرف سے باہر والوں کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہاں ہُن برستے ہیں، سونے
کی بارش ہوتی ہے۔ اور اس سرزمین کا ذرّہ ذرّہ سونے اور چاندی کے
ڈلوں میں تولا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ باہر والے ہمیشہ اس کے فدائی
رہے اور خون کی ندّیاں بہاکر سونا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جہاں سونا
برستا تھا، وہاں پہلے بے گناہوں کا لہو برسا، پھر کہیں اُس زرد اور
سُنہرے دیوتا کے درشن ہوئے۔ باہر سے آنے والوں کے لئے ہمیشہ یہاں
کی راجپوت قومیں ایک رکاوٹ رہیں، اُن کی دلیری، جاں بازی،
وطن پرستی اور قربانی کے جذبے نے ہمیشہ اُنھیں تلواروں کی چھاؤں میں
کھڑا رکھا۔ پہلے اپنا خون بہادیا۔ اُس کے بعد باہر والوں کو اپنی مادرِ وطن
کے انگ پر ہاتھ لگانے کی اجازت دی۔ پہلے خود مٹ گئے اُس کے
بعد اس کے محبت بھرے سینے پر دشمنوں کی فوجوں کے کچل دینے والے
قدم چلے۔ اس لئے راجپوتوں کی زندگی کا یہ پہلو یہاں کی تاریخی زندگی

دوسرا باب

مقامی رنگ

ہمارے افسانوں کی ایک خصوصیت جو اب دن بدن ترقی کر رہی ہے مقامی رنگ یا مقامی اثر کا جذبہ ہے۔ اُردو کے قصّے ابتدا سے فارسی کے تتبع میں لکھے گئے اور اس لئے اُن پر وہی ایرانی آب و رنگ چڑھا ہوا ہے۔ کہیں ایرانی قید سے آزاد ہونے کی کوشش کی گئی تو اُس کے بجائے سحر، جادو، روحانیات، جن، دیو، پری اور اس قسم کی دوسری مافوق الفطرت باتیں شامل کر لی گئیں۔ اور یہ قصّے اور بھی زیادہ غیر فطری ہو گئے۔ لیکن ہمارے دور کے مختصر افسانے میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اُس میں مختلف طریقوں اور رنگوں سے ایسی چیزیں شامل کی گئی ہیں جو ہندوستانیوں کی فطرت، یہاں کی سرزمین، اور یہاں کی آب و ہوا میں پلنے بڑھنے والوں کی فطرت اور خمیر میں داخل ہیں۔ جہاں کہیں اس مقامی رنگ

غاروں پر حکمرانی کرنے والی گندی روح کا ایک بھیانک نمونہ کبھی وہ حسن مجسم ہے اور کبھی صیبوں کی وسیع دنیا۔ یہ مختلف شکلیں خواہ کسی اور نقطۂ نظر سے کیسی ہی ہوں، لیکن کم از کم افسانوی دلکشی اور فن کی لطافتوں کے پیدا کرنے میں بہت بڑی مدد دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ہمارے افسانہ نگاروں نے فن کا اس قدر شدید اتباع کیا ہے کہ جو لوگ اس دنیا سے بے بہرہ ہیں انھوں نے انھیں کافر تک بنا دیا۔ ایسے افسانہ نگاروں پر دنیاوی نقطۂ نظر سے کفر کا فتویٰ عائد ہوتا ہو لیکن فن اُن کی آزادی کو اپنی بڑی زینت سمجھتا ہے۔ اُس کی زندگی کے لئے یہ کفر آمیز نغمے سامان حیات ہیں۔ ایسے افسانوں میں ایک آدھ افسانہ نیاز کا۔ ایک افسانہ اسلم کا اور دو ایک افسانے انگارے کے بے حد قابل قدر ہیں۔ ان افسانوں میں اگر سچ پوچھا جائے تو افسانوی فن کی انتہائی بلندیاں موجود ہیں اور یہ اُردو کے مستقبل کے لئے ایک نیک فال ہے۔

——————
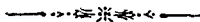
دخل ہے۔ لیکن افسانے نے اب تک جتنی ترقی کرلی ہے اُسے دیکھکر خوشی ہوتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے نفسیات کی اہمیت کا شدید احساس کیا اور اپنے افسانوں کے ہر جزو میں نفسیاتی بلندیوں کو مدنظر رکھا۔ پریم چند، سدرشن، اعظم، سجاد حیدر، نیاز۔ مجنوں۔ افسر جیسے افسانہ نگاروں کے افسانے اس قسم کے بہترین نمونے پیش کرسکتے ہیں۔

افسانوی دلکشی پیدا کرنے کے لئے ہمارے افسانہ نگار اُن میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں اور اپنے افسانوں کو ہر ممکن طریقہ سے فن سے زیادہ قریب لا رہے ہیں۔ اس قسم کی کوششوں میں محبت اور عورت کے مختلف نظریے بے حد دلکش اور دلفریب ہیں۔ مختلف افسانہ نگار نفسیات، شاعری اور رومان کو اپنا مطمح نظر سمجھ کر، محبت اور اُس کے پُر تاثیر سحر کو اپنی اپنی فطرتوں کے رنگ میں رنگ کر نئی نئی شکلوں میں، افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ہر شخص کا نظریہ الگ ہے، اور اُس کے ساتھ ساتھ دلفریب اور فن کا پابند۔ عورت نے ان مختلف ذہنیتوں کی مخصوص دُنیاؤں میں ڈوب کر ایک سے زیادہ ایک مسحور کُن شکلیں اختیار کرلی ہیں۔ کبھی وہ عالم بالا کی ایک نورانی مخلوق دکھائی دیتی ہے، کبھی معصیت کے گھرے

وہ اُردو کے افسانوں میں رفتہ رفتہ اس طرح داخل ہوگئی ہیں کہ اب بالکل ابتدائی مختصر افسانوں میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

مقامی اثر افسانے کے لئے ایک بہت ضروری چیز ہے اور اچھے اچھے افسانہ نگار اس چیز کو فن کا ایک بہت ضروری جزو قرار دیتے ہیں۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے افسانوں میں مختلف قسم کے مقامی اثرات جلوہ گر نظر آتے ہیں، اور ہم ان افسانوں کو پڑھ کر اپنے ملک کی اکثر اہم خصوصیات، اُن کی فطری، سیاسی، تاریخی، قومی، اقتصادی اور سماجی خصوصیات اور انقلابات کا پتا لگاتے ہیں۔ پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسنی، فضل حق قریشی کے افسانے اس حیثیت سے بہت قابل قدر ہیں۔

اُردو کے افسانوں میں شروع سے جو کمی محسوس کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اُن میں فطرت کو قطعی دخل نہیں۔ چنانچہ بالکل شروع کے مختصر افسانوں میں نفسیات اور منطق کو بہت کم دخل ہے۔ کرداروں میں اُن کے افعال میں، اُن کی حرکات و سکنات میں، اُن کی گفتار و رفتار میں، ہر جگہ بے آہنگی اور نفسیاتی مشاہدات کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن میں فطرت کو

افسانہ نگاروں نے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ترجمے کئے۔ ابتدائی ترجمہ کرنے والوں میں سب سے پیش پیش سجاد حیدر اور نیاز فتح پوری ہیں۔ سجاد حیدر نے زیادہ تر ترکی افسانوں کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اس وقت سے اُردو میں رومانی طرز کے افسانوں کی بنیاد پڑ گئی۔ سجاد حیدر اور نیاز نے اس رنگ کو بے انتہا ترقی دی۔ اِن ترجموں کا اس درجہ رواج ہوا کہ رفتہ رفتہ ہماری زبان میں روس۔ فرانس۔ ہالینڈ۔ امریکا۔ انگلستان۔ ترکی۔ ایران اور بنگال کے بہترین افسانوں کا ترجمہ ہونے لگا اور اب اعلیٰ درجہ کے ترجموں کی ایک اچھی خاصی تعداد اُردو میں موجود ہے۔

ابتدائی دَور کے افسانوں سے قطع نظر اگر ہم اب سے کوئی پندرہ برس تک کے افسانوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہمیں حیرت انگیز ترقیاں نظر آئیں گی۔ بالکل شروع میں اصلاحی مقصد اس قدر چھایا ہوا تھا کہ فن کا احساس تک ہونا غیر ممکن تھا۔ فن ہمارے دلوں اور ہمارے لطیف احساسات پر جو گہرا اثر ڈالتا ہے اُس سے ہماری زبان کے افسانے بالکل محروم تھے۔ اس کے علاوہ بھی افسانوں کے لئے جو بہت سی باتیں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

مغرب کے سیمیں تن عشوہ گروں کی پرکاریوں پر نثار کی جا رہی تھیں۔ بادۂ مغرب کے چھلکتے ہوئے جام آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن رہے تھے۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس ظاہری آب و تاب سے اتنے متنفر ہوئے، ان مغرب پرستیوں کو اس بری نظر سے دیکھنا شروع کر دیا کہ ایک آن بھی انھیں نہ بھایا کہ اُن کے ہم وطن اُن چیزوں کا شکار ہوں جو حقیقت میں بری ہیں، جن کا انجام مہلک اور خطرناک ہے۔ اس لئے مختلف طریقوں سے اُن کی اصلاح کی کوشش کی۔ اُن کے برے نتائج کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ مختصر افسانوں کو بھی اردو میں شروع میں ان اصلاحی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا گیا۔ چنانچہ سلطان حیدر جوش کے اس ابتدائی دور کے افسانوں میں مغربی تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کے برے نتائج کو دکھا کر لوگوں کو اُن سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان ابتدائی افسانوں میں اصلاحی مقصد اکثر اس قدر تیز ہو گیا ہے کہ فن اور اُس کا حسن قطعی ناپید ہو گیا ہے، اور ہم افسانوں کو محض مصلح کی تقریر سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ افسانوی دلکشی اُس میں نام کو نہیں۔

اسی ابتدائی دور میں مغرب کا ایک گہرا اثر یہ پڑا کہ ہمارے

اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں افسانوی فن کی ابتدائی منزلوں کے نشانات موجود ہیں۔

میر ناصر علی کے بعد سے اردو میں افسانہ نگاری ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے اختیار کر لی گئی اور سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر اردو کے بالکل ابتدائی افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں۔

یہی زمانہ تھا جب اردو میں صحافت برابر ترقی کرتی جا رہی تھی۔ اور اب لوگ بجائے روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کے ماہواری رسالہ نکالنے کی طرف توجہ کر رہے تھے۔ ان رسالوں کے نکلنے کی وجہ سے افسانوں کی ضرورت زرا زیادہ محسوس ہونے لگی۔ اور ان میں دلچسپی پیدا کرنے کا سب سے اچھا اور آسان ذریعہ بھی افسانے بن گئے۔

انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جب ہندوستان والے مغرب کے زیادہ سے زیادہ والہ اور شیدائی بن چکے تھے۔ مغرب کی ہر چیز کو متبرک سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کی تقلید کو اپنا ایمان۔ جہاں عوام کی یہ حالت تھی کہ مغربی تعلیم اور فیشن۔ قدیم روایات اور تہذیب کی جگہہ لیتے جا رہے تھے "سایہ کی سن سن میں گھنگھرو لی صدا" کا احساس تک باقی نہیں رہا تھا۔ محبوب مشرقی کی سادگیا

اعتبار سے اچھا کہہ سکتے، لیکن بیسویں صدی کے شروع سے اُردو میں ایک ایسی چیز کی بنیاد پڑ گئی کہ لوگ اُس کے آگے ناول کو بالکل بُھلا بیٹھے۔

مختصر افسانہ اُردو میں ٹھیک کس وقت شروع ہوا اور اُردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا صحیح جواب دینا اس قدر مشکل ہے کہ ہم اسے آسانی سے غیر ممکن کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اُردو میں مختصر افسانہ نویسی کی ابتدا موجودہ صدی کے بالکل ابتدائی حصّے میں ہوئی۔

مغربی ادب نے جہاں اُردو ادب کے اور بہت سے حصّوں پر گہرا اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہاں افسانہ نویسی کی یہ نئی روش بھی اُردو کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اُردو میں افسانہ نویسی کا سنگِ بنیاد تو حقیقت میں اُسی دن سے پڑ گیا تھا جب سے آزاد کی نیرنگِ خیال منظرِ عام پر آئی۔ نیرنگِ خیال گو بظاہر ایک نئے طرزِ نگارش کی تقلید ہے لیکن حقیقت میں وہ افسانوی ادب کی ایک زیادہ شاعرانہ شکل ہے۔ آزاد کے اسی رنگ میں چند تمثیلی افسانے میر ناصر علی مرحوم نے لکھے جو وقتاً فوقتاً "چودھویں صدی" اور "صلائے عام" میں شائع ہوئے۔ اِن تمثیلات کو ہم حقیقت میں افسانہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن

قصّوں کے بعد اخلاقی قصّوں نے جگہ لی۔ اور فورٹ ولیم کالج قائم ہونے کے بعد سے اُردو میں مافوق الفطرت اور طویل داستانوں کی بھرمار شروع ہوگئی۔ اور نصف صدی سے زیادہ تک یہ روش قائم رہی۔ نذیر احمد نے ان مافوق الفطرت قصّوں کو چھوڑ کر گھریلو زندگی کے روزانہ واقعات کو قصوں یا ناولوں کی شکل میں لکھا اور اُن میں فطرت کو زیادہ سے زیادہ دخل دینے کی کوشش کی اور اُس میں کامیاب ہوئے۔ اس ابتدا کے بعد سے اُردو میں ناول نگاری کا رواج قائم ہوگیا اور سرشار، سجاد حسین، شرر اور محمد علی نے بہت سے ناول اُردو میں لکھے۔ انگریزی کا اثر ذرا زیادہ ہوا تو ان ناولوں میں ناول نگاری کا فن اور اُس کی باریکیاں داخل ہونے لگیں۔ اور آخری زمانہ میں رسوا۔ ظفر عمر اور فیاض علی۔ پریم چند اور سدرشن نے ایسے ناول لکھے جن میں فن کا کافی دخل موجود ہے۔ لیکن اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو اُردو میں ناول نگاری قریب قریب مفقود ہے۔ اور اب تک اس صنف میں جو کوشش کی گئی ہے وہ انگریزی کے مقابلہ میں اور فن کے اعتبار سے کچھ زیادہ بلند نہیں۔ ممکن ہے کہ ناول نگاری اب تک کافی ترقی کر لیتی اور اُس میں چند ناول ایسے ہوتے کہ اُنھیں ہم فن کے

بن گئی۔ حُسن وعیب، معصیت وپاک دامنی ۔ فطرت اور اُس کی نیرنگیاں، فلسفہ اور اُس کی باریک بینیاں، نفسیات اور اُس کے آتار چڑھاؤ، غرضیکہ کوئی چیز ایسی نہیں بچی جسے افسانے کے پلاٹ کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔

فرانس اور روس نے اسے خاص طور پر فن کی نزاکتوں اور بلندیوں سے اس قدر مالا مال کیا کہ فرانسیسوں اور روسیوں کے افسانے ۔ افسانہ نگاری کے فن کے بہترین نمونے سمجھے جانے لگے۔ لارنس اور جوائس نے انگلستان میں افسانے کو فن کا پابند بنایا اور اُسے فن کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ بلند بنانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔

امریکا میں مختصر افسانے نے ان سب جگہوں سے زیادہ ترقی کی اور حقیقتاً امریکا والوں نے جتنے مختصر افسانے لکھے۔ اُن کی تعداد اتنی ہے کہ دنیا کا کوئی ادب اس حیثیت سے اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اُردو میں افسانہ گوئی کوئی نئی چیز نہیں۔ اُس میں افسانوں کی ابتدا بھی اُسی وقت سے ہو گئی تھی جب سے اُردو کی ابتدا ہوئی لیکن اُردو کے یہ قصّے عموماً بالکل شروع میں مذہبی تھے۔ مذہبی

زمانہ نے اور ترقی کی تو افسانے کو صرف فن کا پابند بنانے کی
کوشش کی گئی۔ اسٹیونسن کے افسانے انگلستان میں اس حیثیت
سے قابل قدر نمونے ہیں۔ واشنگٹن ارونگ اور پو نے افسانے کی
فنی بلندیوں میں طرح طرح کے اضافے کئے۔ یہاں تک کہ رسالوں
اور ادبی پرچوں کی تعداد دن دونی اور رات چوگنی ہوتی گئی۔ رسالو
کے ساتھ افسانوں کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہوئی۔ اس لئے
افسانے بہت بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ پو کے افسانوں میں فن کی
پابندی تھی۔ لیکن ان میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ اُس کا اظہار
ہو جاتا تھا۔ فن کے لئے یہی چیز سب سے زیادہ مہلک ہے۔ پو کے
بعد آنے والے زمانہ میں افسانے کو وسیع سے وسیع بنانے کی کوشش
کی گئی۔ دُنیا کی ہر چیز کو اُس کا موضوع بنایا گیا۔ انسانی جذبات
میں غم و غصّہ، سرور و انبساط، رشک و حسد، ظلم و ستم، رحم و کرم،
خوف و ہراس، غرض ہر چیز کو افسانے کے مواد کے لئے کام میں لایا گیا۔
کائنات میں پھیلی ہوئی ہر چیز اُس کی وسیع دنیا میں شامل ہو گئی۔
بہشت و دوزخ کے خیالی اور حقیقی تصورات نے افسانہ میں جگہ پالی۔
رومان و محبت کے علاوہ روحانیت اور مادیت کے کرشمے اس میں
جلوہ گر ہو گئے۔ خواب و خیال کی دُنیا اس کا بے حد دلچسپ موضوع

مذہبی قصوں کے بعد عموماً ایسے قصے لکھے گئے جن کا مقصد تلقین اخلاق تھا۔ ہر ملک اور ہر زبان میں ایسے افسانوں کا ایک خاص دور رہا ہے اور یہ قصے بعض بعض زبانوں میں اس قدر مقبول ہوئے ہیں کہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی انھیں اسی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ مثال کے لئے ہشت اپدیش گلستاں اور ایسپ کی کہانیوں (Aesops Fables) کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

ان اخلاقی قصوں کے بعد رومان نے تھوڑا بہت دخل دینا شروع کر دیا۔ اور یورپ کے ادب میں خصوصاً کہانیوں اور قصوں کا جزو خاص رومان اور محبت کو سمجھا نے لگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی چونکہ ان افسانوں اور قصوں میں فن کی نازک اور لطیف سحر کاریاں نہیں تھیں اس لئے یورپ کے ہر حصہ میں ناول کا دور دورہ شروع ہوا۔ فرانس اور اٹلی نے اس معاملہ میں پیش قدمی کی۔ انگلستان میں ترجمے ہوئے اور اس کے بعد ناول نگاری نے ادب میں ایک خاص درجہ حاصل کر لیا۔

اُنیسویں صدی کے شروع میں بعض ناول نگاروں نے مختصر افسانے لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ان مختصر افسانوں میں عموماً اخلاقی جزو بے حد نمایاں رہتا تھا۔

قصّے۔ اُس کے افسانے بھی انھیں جانبازی اور دلیری کے کارناموں کے عکس ہونے لازمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قریب قریب ہر مُلک کے ابتدائی قصّے عموماً جانبازی اور دلیری کے افسانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ عرب کے قبل اسلام کے قصّے۔ ہندوستان کی مہابھارت کی خونچکاں داستان۔ یونان کے ابتدائی قصّے۔ جرمنی اور اسکینڈی نیویا کے ابتدائی افسانے اور اس کے بعد خود فرانس اور انگلستان کے ابتدائی قصّے ان جانبازیوں کے کارناموں کے عکس ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کم و بیش وہی جذبہ اور اثر موجود ہے جو اس قسم کے افسانوں کا ایک لازمی جزو ہے۔

بہادری کے قصّوں کے بعد افسانوی دنیا میں دوسری چیز جس کا اثر نظر آتا ہے وہ مذہب ہے۔ مذہب نے انسان کے دل پر مختلف جگہوں اور زمانوں میں جو اثر رکھا ہے اُس کا اثر موجودہ تہذیب اور ترقی کے زمانے میں بھی نمایاں ہے لیکن ابتدائی زمانوں میں مذہب کا جتنا گہرا اثر تھا اُس کے ثبوت میں وہ افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں جو مذہبی روایتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے لکھے گئے۔ ایسے قصے عموماً ہر مُلک اور ہر قوم میں نظم میں لکھے گئے۔ اور ہر زبان میں ایسے قصّوں کی کافی تعداد افسانوی ادب کا پیش خیمہ ہے۔

کرنے کے آلے، ذہن انسانی کی رسائی سے باہر تھے اس وقت افسانہ لوگوں کے دلوں پر مسلّط تھا۔ اُس وقت افسانے کو سب سے دلچسپ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ انسان کو صرف اپنی ذات سے محبت تھی اور افسانے میں اُس کی ہستی مختلف شکلوں میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔

انسان کی ابتدائی زندگی، تہذیب اور تمدن کے سکون آمیز اضطرابات سے بالکل بیگانہ تھی۔ وہ دُنیا میں ضرورتوں اور خواہشوں کا پُتلا بن کر آیا۔ ابتدائی زندگی میں ان ضروریات کے حصول اور خواہشات کی تکمیل کے لئے سامان نہیں موجود تھے۔ ضرورتیں زیادہ اُن کے حاصل کرنے کے طریقے محدود۔ خواہشیں غالب اور اُن کی تکمیل کے سامان مفقود۔ نتیجہ لازمی تھا۔ ہر شخص اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زور بازو سے کام لینے پر مجبور تھا۔ جس میں طاقت تھی ضروریات اُس کی غلام جس میں قوت اور سکت تھی سامان زندگی اُس کے لئے فراواں۔ اس لئے ہر شخص کو صرف اپنی قوت بازو پر بھروسا تھا۔ ہر شخص جانباز اور دلیر۔ ہر شخص کشت وخون پر آمادہ۔ ہر شخص جنگ وجدال کا شیدائی اور دیوانہ۔

زندگی کی اس پہلی منزل کا عکس بھی لازمی طور پر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ حیات کا جزو صرف کشت وخون ہوگا، اُس کا افسانوی عکس۔ اُس کے

ہوتا ہے جتنا خود ہماری زندگیوں میں ۔ افسانوی کردار سوائے ایک مادّی حقیقت کے ہر حیثیت سے مکمّل سے مکمّل طریقہ پر ہمارا نمونہ اور ہماری زندگی کا بہترین عکس بن سکتے ہیں ۔ اسی لئے ہم افسانوں کو اپنے سارے دلچسپ مشغلوں میں سب سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں ۔ مادیت سے ہمیں روحانیت کے مقابلہ میں زیادہ دلچسپی ہے ۔ دُنیاوی لذتیں ہمارے لئے زیادہ کیف آور ہیں ۔ افسانے کے علاوہ موسیقی ۔ مصوّری ۔ سنگ تراشی اور رقص، ہر فن کو روحانیت اور جذبات سے زیادہ گہرا تعلق ہے، اسی لئے افسانہ دُنیا میں سارے فنون لطیفہ میں سب سے پہلے پیدا ہوا ۔ اور سب سے پہلے لوگوں نے اسے اپنی دلچسپی کا ایک اہم مشغلہ سمجھنا شروع کیا ۔

یہی وجہ ہے کہ ہر ترقی یافتہ قوم کی زندگی میں ہمیں افسانوں کا پتا بہت پہلے سے چلتا ہے ۔ مشرق سے لے کر مغرب تک ۔ چین، جاپان، ہندوستان ۔ اور عرب سے لے کر یونان ۔ اٹلی اور فرانس تک، ہر جگہ ہمیں افسانے کی ابتدائی شکلیں ہزاروں برس پہلے سے ملتی ہیں ۔ جب تہذیب نے کائنات پر حکمرانی نہیں شروع کی تھی، جب فطرت انسانی تمدن اور دُنیاوی اخلاق کی بندشوں سے آزاد رہ کر صرف فطرت کی آغوش میں پل رہی تھی، جب مَنیت اور زہد میں تمیز

سازِ دل کا کوئی نہ کوئی باریک تار بندھا ہوا ہے۔ مصوّر کے رنگین تصوّرات کے وہ آب و رنگ میں ڈوبے ہوئے باریک نقوش ہمارے دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اس آب و رنگ میں زندگی کا عکس اپنی ہلکی شعاعیں شامل کرتا رہتا ہے۔ یہ تصویر کسی ایسی حقیقت کا ایک فنّی عکس ہے جس سے ہماری آنکھیں اور ہمارا احساس اس سے پہلے آشنا ہو چکا ہے۔

مختصر یہ کہ لطیف فنون کی ہر شاخ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہمیشہ سے ایک پُر تاثیر سحر سمجھی جاتی رہی ہے۔ اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان میں سے ہر ایک فن کو حیاتِ انسانی کے کسی نہ کسی پہلو سے ایک گہرا تعلق رہا ہے۔

فنونِ لطیفہ کی مقبولیت کی جو وجہ بتائی گئی، بالکل یہی وجہ افسانے کی مقبولیت کی بھی ذمہ دار ہے۔ افسانہ دوسرے فنونِ لطیفہ کے مقابلہ میں کیوں زیادہ مقبول رہا؟ کیوں اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں نے اپنا سب سے دلچسپ مشغلہ سمجھا؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ افسانے میں مادّی اور روحانی کیفیتوں کے عکس دوسرے فنون سے کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ افسانے میں حیاتِ انسانی اور اُس کے سارے واقعات، جذبات، احساسات اور کیفیات کا عمل اور اثر اسی حد تک اور اُسی درجہ

پہلا باب

ابتدا اور ارتقا

انسان کو دُنیا کی کسی دوسری چیز سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں جتنی خود اپنے آپ سے - ہر وہ چیز جس میں اُس کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی جلوہ فرمائیوں کا عکس ہے اُس کی دلچسپی کا بہترین شغلہ ہے - وہ ایک وقت میں ایک بات سُنتا ہے - دوسرے وقت اُس کے کان اِن سُنے ہوئے لفظوں کی صوتی تصویروں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں - جو نغمے ایک مرتبہ کان میں گونج چکے ہیں اُن کی بازگشت اُس کے لئے دُنیا میں سب سے شیریں اور جان پرور ہے - کانوں سے زیادہ ہماری آنکھیں + اور آنکھوں سے زیادہ ہمارا احساس ہر قدم پر زندگی کی ان عکسی

ہمارے افسانے